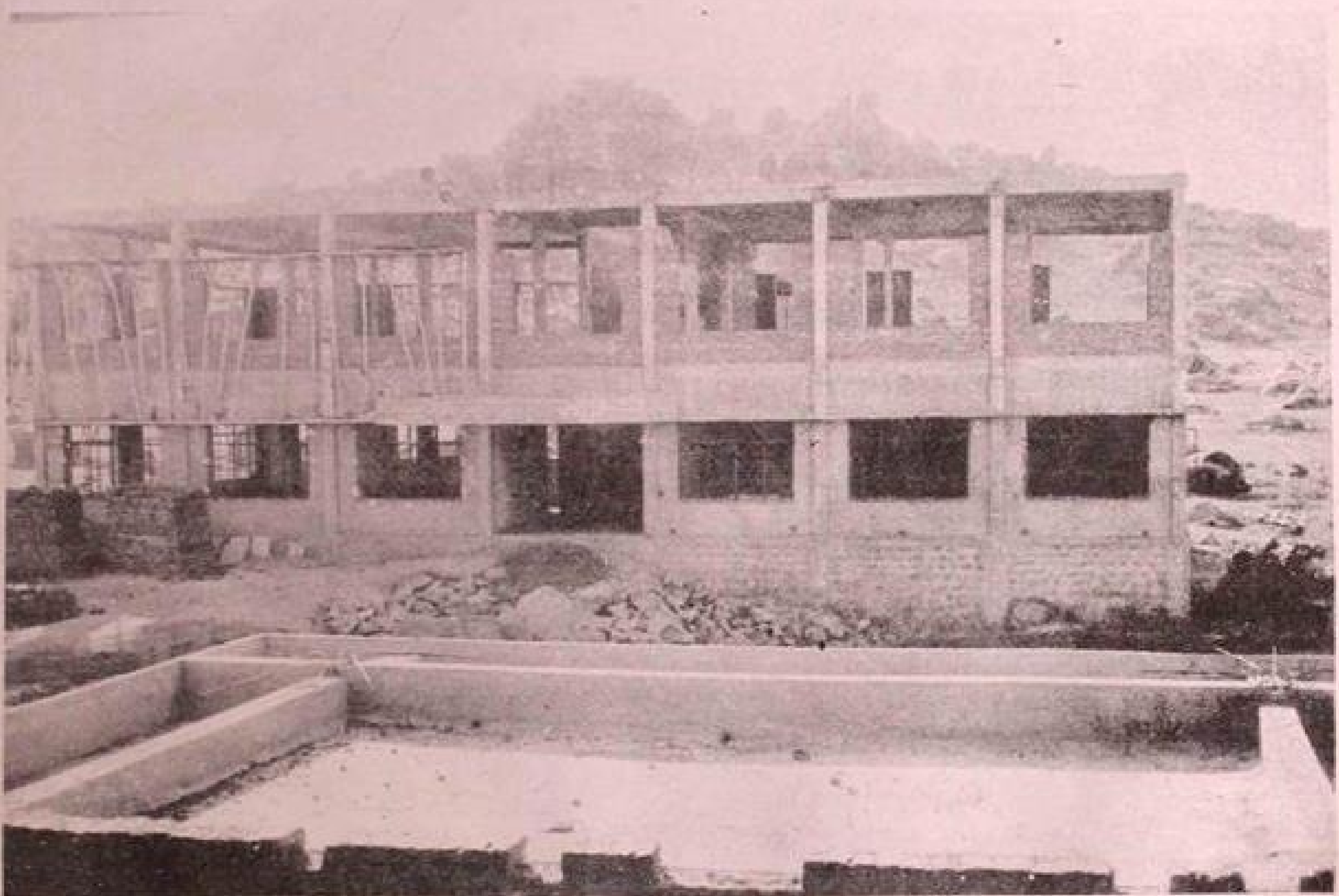
صفا



دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی ... زیر تعمیر چار منزلہ عظیم الشان لائبریری کا ایک منظ

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

مدیر اعلیٰ: محمد رضوان القاسمی

مدیر: خالد سیف اللہ رحمانی

شمارہ ۷ ○ صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ م اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء

○ سالانہ:	۴۰/- روپے
○ معاون خصوصی:	۱۰۰/- روپے
○ فی پرچہ:	۱۰/- روپے

ناشر: شعبۂ نشر و اشاعت، دار العلوم سبیل السلام

پوسٹ بالا پور، حیدر آباد ۵....۰۵ انڈیا

فون: ۲۳۹۳۵۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

ہمارے ملک کے معماروں نے اس ملک کی بنیاد امن و آشتی پر رکھی تھی، بابائے قوم گاندھی جی کا سب سے بڑا امتیاز یہی عدم تشدد کا فلسفہ تھا اور اس فلسفہ کی قربان گاہ پر انہوں نے اپنی جان نچھاور کر دی، چھ سات سو سالوں سے ہندو اور مسلمان اس ملک میں ایک ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوش بدوش اس ملک کی خدمت کر رہے ہیں، انگریزوں کی آمد سے قبل یہ ملک فرقہ وارانہ فسادات اور غارت گری کے نام سے نا آشنا تھا، مگر انگریزوں نے اپنی ساکھ کو مضبوط کرنے اور حکومت کو مستحکم کرنے کی غرض سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے تخم بوئے اور قریب ایک صدی تک اس کے پھل کھائے۔

مگر افسوس کہ انگریز خود چلے گئے، لیکن آج تک ہندوستان کی قومی حکومتیں اس فرقہ واریت کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں، بلکہ دن بہ دن نفرت کا یہ پودا تناور اور طاقتور ہوتا جا رہا ہے، ہمارے ملک میں قومی سطح کی ایسی جماعتیں موجود ہیں، جن کا مقصدِ تشکیل ہی اس آتشِ عداوت کو بھڑکانا اور اسے تیز تر کرنا ہے، آزادی کے بعد سے ہزاروں جانیں ہیں جو اس قربان گاہ پر چڑھ چکی ہیں ——— ادھر چند سالوں سے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک نئی لہر شروع ہوئی ہے، ایسی لہر جس میں جوان اور بوڑھے، مرد اور عورت، کم عمر بچوں اور عمر دراز معذور لوگوں کا کوئی فرق نہیں ہے، شقاوت کی حد یہ ہے کہ بعض جگہ ٹرین سے بے قصور مسافرین کو اتار کر ان کی جان و آبرو سے کھیلا جاتا ہے۔

بھاگلپور کے حالیہ فسادات نے گذشتہ تمام فسادات کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں، یہ فساد نہ تھا، بلکہ نسل کشی تھی، جس میں محلے کے محلے ویران کر دیے گئے، گاؤں کا گاؤں نذرِ آتش ہو گیا، متعدد گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک دو مسلمان گھر باقی رہ گئے ہیں، گاؤں کے تمام مسلمان شہید کر دیے گئے اور اجتماعی طور پر ان کا قتلِ عام ہوا، مسجدیں منہدم کر دی گئیں، عورتوں کی بے آبروئی ہوئی اور وہ کچھ ہوا جن کو سن کر جبینِ انسانیت عرق آلود

ہوجائے ــــــــــ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے زیر سایہ ہوا اور بہار ملٹری پولس کے نام نہاد محافظ دستہ نے اس قتل و غارت گری کی قیادت کی، جس ملک میں اس طرح انسانی جان و مال کی ارزانی ہو اور جہاں درندوں سے بڑھ کر انسان خون آشام اور خونخوار بن جائیں، وہ کیونکر اقوامِ عالم میں سرخ رو ہو سکتا ہے اور کس طرح خود کو عذابِ خداوندی سے بچا سکتا ہے؟

بہار حکومت کے سابقہ انتظامیہ نے جس نااہلی اور ناکارگی کا ثبوت دیا اور جس طرح فساد پر قابو پانے میں ناکام رہی وہ کسی انتظامیہ کی ناکامی اور نااہلی کی انتہا ہے، اور ملک کی اخلاقی حالت، انسانیت اور نظم و نسق کے لئے ایسا داغ ہے کہ اس کا صاف کرنا آسان نہیں، بدقسمتی سے جب جب اس طرح کے فسادات ہوتے ہیں حکومت ایسے منصوبے بنانے کا اعلان کرتی ہے کہ اس کے ذریعہ آئندہ امن و امان کو برقرار رکھا جا سکے، مگر یہ "ارادہ" اور "اعلان" کبھی عمل کے سانچے میں ڈھل نہیں پاتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ اور خود مسلمانوں کے سمجھ دار زعماء و قائدین اس کے لئے سنجیدہ اور مسلسل کوششیں کریں اور ایسی تدبیروں کو انجام تک پہونچائیں، مثلاً انسدادِ فساد فورس کی تشکیل اور اس میں اقلیت کا مناسب تناسب، اجتماعی جرمانہ، خاطی عہدیداروں کی مناسب سرزنش وغیرہ۔

تاہم مسلمان اس بات پر مبارکباد کے حقدار ہیں کہ جس طرح یہ فساد آزاد ہندوستان کی تاریخ کا بھیانک ترین فساد تھا، اسی طرح مسلمانوں نے بھاگلپور کے مظلوم و ستم رسیدہ مسلمانوں کی طرف محبت اور مدد کا جو ہاتھ بڑھایا ہے اور جس طرح ملک کے کونے کونے سے مسلمانوں نے مدد کی ہے وہ بھی ایک یادگار واقعہ ہے، جس کا محرک اسلامی اخوت و بھائی چارگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

نومبر کے اواخر میں ملک کی پارلیامنٹ کا نواں الیکشن ہوا، اس الیکشن نے کئی وجوہ سے خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی، ایک طرف شیلانیاس اور اس سلسلہ میں سابقہ کانگریسی حکومت کی غلط بیانی، دوسری طرف ملک کے مختلف شہروں اور خصوصیت سے بھاگلپور میں فسادات کی لہر اور حکومت کی ناکامی اور انتظامیہ کا فسادیوں سے تال میل، تیسری طرف حکومت میں بڑھتی ہوئی رشوت ستانی اور بوفورس توپ کا مسئلہ، اسی کے ساتھ پنجاب، کشمیر اور سری لنکا کے تمل باشندوں اور محارب دھڑوں کے مسائل، حزب اختلاف کا اتحاد، اقلیتوں کی برسرِ اقتدار حکومت سے ناراضگی اور انتہا پسند ہندوؤں کی باہم یک جہتی۔ ان سارے مسائل نے

اس الیکشن کو وقار کا الیکشن بنا دیا تھا اور آخر اس نے اپنا فیصلہ کانگریس کے خلاف سنایا۔

نئی حکومت سے عوام کو بڑی توقعات اور امیدیں ہیں، اپنے آغاز ہی میں اس نے متعدد اہم قدم اٹھائے ہیں، اس کو دو ایسی جماعتوں سے مفاہمت کے ساتھ حکومت کرنی ہے، جو نظریاتی اعتبار سے دو الگ الگ حدوں پر ہیں، یہ ایک مشکل کام ہے، اور موجودہ وزیر اعظم جناب وی، پی سنگھ کی فراست اور دانائی سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کشتی کو پار لگا سکیں گے ——— مسلم قیادت کے لئے یہ بہترین موقع ہے کہ وہ نئی حکومت کے ساتھ مداہنت اور ملت فروشی کے بغیر ——— مفاہمت اور تعاون کا رویہ اختیار کریں اور مسلمانوں کے دیرینہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

کمیونزم کا نظام استبداد اپنی کشش تو بہت پہلے ہی کھو چکا تھا، اور جن ملکوں میں کمیونسٹ نظام قائم تھا، مٹھی بھر مقتدر لوگوں کو چھوڑ کر عام لوگوں میں اس سے جس طرح کی نفرت تھی وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ البتہ سویت یونین کی غیر معمولی عسکری قوت اور دار و گیر کی وجہ سے اب تک یہ نظام زندہ تھا، مگر یہ ایک غیر فطری عمل تھا اور اس کو بہت دنوں تک باقی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کمیونسٹ ملکوں میں اندر ہی اندر سخت بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا، پوری دنیا کے انسانوں سے ان کا رشتۂ اخوت کاٹ دیا گیا تھا اور وہ با اختیار، قوتِ ارادی سے مالا مال، با ضمیر اور حساس انسانوں کی طرح نہیں، بلکہ بے جان و بے دل جمادات کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

روس میں مسٹر گورباچوف منصبِ صدارت پر فائز ہوئے تو انہوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ ان حالات کا ادراک کیا اور محسوس کیا کہ یہ غیر فطری نظام زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتا، اس طرح سب سے پہلے روس انگڑائی لی اور وہاں اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا، پھر جب اشتراکیت کے اصل مرکز میں یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں تو اس نے بہت جلد مشرقی یورپ کے ممالک میں پیش قدمی شروع کر دی اور پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی میں اپنا کام کرتی ہوئی ایسی بلاخیزی کے ساتھ رومانیہ میں داخل ہوئی، کہ گو اس نے ہزار ہا انسانوں کی جان لی مگر اس وقت تک نہ رکی جب تک کہ اشتراکیت کی بساط الٹ نہ گئی، بلغاریہ میں بھی اصلاحات اور تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، چین کا ردعمل ہر چند کہ ابھی شدید ہے، مگر وہ وقت دور نہیں کہ اس کو بھی اس طوفان کے سامنے سپر انداز ہو جانا پڑے گا۔

یہ وقت بہت نازک اور تاریخی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اور مسلم ممالک پوری سنجیدگی کے ساتھ ان حالات کا جائزہ لیں اور تدبر و دانشمندی کے ساتھ ان ممالک میں ملنے والی مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھائیں، نہ لوگ جو نسلی اعتبار سے مسلمان تھے ان کو دامنِ اسلام میں واپس لانے کی سعی کریں، تدریج و مصلحت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیں، ان ممالک میں منصوبہ بند طور پر دعوتِ دین کا کام کریں اور مسلم ممالک بھی ان سے اپنے تعلقات اس طرح استوار کریں کہ ان سے مذہبی فائدے اٹھائے جا سکیں۔ آج مسلم مسائل کے حل کیلئے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ "مرکز البحث العلمی" پھلواری شریف پٹنہ نے جدید پیش آمدہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں جس سعی کا آغاز کیا تھا، وہ منصوبہ بند طور پر آگے بڑھ رہی ہے، اب یہ مرکز مزید وسعت کے ساتھ "مجمع الفقہ الاسلامی ھند" (اسلامی فقہ اکاڈمی ہند) کے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں ۹ر ۱۰ر ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو ہمدرد نگر دہلی کے "ہمدرد سمینار ہال" میں جدید مسائل پر غور و خوض کے لئے اپنی نوعیت کا دوسرا سمینار منعقد ہوا، اس سمینار میں بنک انٹرسٹ، مخصوص حالات میں سودی قرض کا حصول، ہندوستان کی شرعی حیثیت، مروجہ نوٹوں اور سکوں کی فقہی حیثیت، جیسے اہم مسائل پر غور و خوض کیا جانا تھا، اس کے علاوہ گذشتہ سمینار میں اعضار کی پیوند کاری اور پگڑی کے مسائل پر کسی آخری نتیجہ تک نہ پہونچا جا سکا تھا، ان پر علمار کی رائیں مطلوب تھیں۔

بحمداللہ گذشتہ سمینار کی طرح یہ سمینار بھی نہایت کامیاب و نتیجہ خیز رہا، مصر و پاکستان کی بعض موقر علمی و دینی شخصیتوں کے علاوہ ہندوستان کے تمام اہم تعلیم و افتار کے مراکز کے نمائندے شریک رہے، مسلمانوں کے تمام مکاتب فقہ اور مکاتب فکر نے پوری فراخ قلبی اور وسیع النظری کے ساتھ ایک دوسرے کے خیالات سنے اور ملک کے مختلف گوشوں کے ممتاز علمار کی شرکت نے اس سمینار کو پورے ملک کے اہلِ علم و تحقیق کا نمائندہ اجلاس بنا دیا، اس اجلاس میں اکثر زیر بحث مسائل پر علمار کا اتفاق بھی ہو گیا، اس لحاظ سے یہ اجلاس زیادہ نتیجہ خیز رہا ——— اکاڈمی کے امین عام حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اپنے اس اہم کام پر ہم سب کے شکریہ اور پوری امتِ مسلمہ ہند کی طرف سے بہترین جزار کے حقدار ہیں۔

"صفا" کا یہ شمارہ بھی مختلف مضامین اور تحریروں سے آراستہ ہے، اس شمارہ میں قرآنیات کے موضوع پر قارئین ایک اہم تحریر پڑھ سکیں گے، جو قرآن کے جمع و تدوین اور اس سلسلہ میں مستشرقین کی طرف سے اٹھائے جانے والے بعض اعتراضات کے رد پر ہے۔ مشہور صاحب علم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کی تالیف عثمان ذوالنورینؓ پر ایک تنقید بھی آپ پڑھ سکیں گے، جو اس کی اہمیت کے پیش نظر مصنف مرحوم کی وفات کے باوجود شائع کی جارہی ہے۔ حضرت خضر پر ایک مضمون شریک اشاعت ہے، جو گذشتہ شمارہ کا بقیہ ہے ——— "سلمان رشدی اور اظہار رائے کی آزادی" کے موضوع پر ایک اہم تحریر بھی آپ پڑھ سکیں گے ——— حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب کا ایک عالمانہ اور فکر انگیز خطبہ بھی علم حدیث کے موضوع پر قارئین ملاحظہ فرماسکیں گے

اس کے علاوہ "صفا" کے مستقل عنوان کے طور پر ہر شمارہ میں کسی ایک اہم جدید فقہی مسئلہ پر بحث کی جاتی ہے، اس شمارہ میں مرغیوں کو ذبح کرنے کے بعد آلائش نکالنے سے پہلے ہی گرم پانی میں ڈال دیے جانے کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے، شہروں میں اس مسئلہ نے "ابتلائے عام" کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ مضمون عوام و خواص اور علماء، اور ارباب افتاء کے لئے یکساں قابل مطالعہ ہے۔ فقہی سوال و جواب کے عنوان ہر شمارہ میں دارالافتاء دارالعلوم سبیل السلام کے چند مختصر فتاویٰ درج کئے جاتے ہیں، ان سے بھی قارئین استفادہ کرسکیں گے، ان کے علاوہ اسلامی ادبیات میں بعض نظمیں بھی قارئین کی ضیافت کے لئے پیش ہیں ——— امید ہے کہ آپ دوسرے شماروں کی طرح اسے بھی پسند کریں گے۔

اخیر میں عرض ہے کہ اس زمانہ میں کسی دینی رسالہ اور بالخصوص ایسا رسالہ جس پر علم و تحقیق کا رنگ غالب ہو، کی زندگی اس پر موقوف ہے کہ دین دوست اور علم دوست حضرات اپنے تعاون کا ہاتھ بڑھائیں، اور اس کی کم سے کم صورت یہ ہے کہ وہ اس کے خریداروں کے حلقہ میں اضافہ کی فکر کریں، "صفا" بھی اپنے ہمدردوں کی طرف سے اسی دستِ تعاون کا منتظر ہے!!

محمد رضوان القاسمی

۷ رجمادی الاخریٰ ۱۴۱۰ھ

دوسری اور آخری قسط

حضرت خضرؑ کی نبوت اور حیات کا مسئلہ

مولانا نسیم احمد قاسمی

نبوتِ خضر

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضرؑ جنہیں قرآن مقدس نے "فوجدا عبدا من عبادنا" سے یاد کیا ہے، منصب نبوت پر فائز تھے، البتہ رسول نہیں تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت خضر نبی نہیں تھے، بلکہ صرف ولی اور پارسا تھے،

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ عبد صالح تھے، امام رازی کا بھی رجحان اسی طرف ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، بلکہ ولی تھے، مگر صراحۃً انہوں نے ان کی نبوت کا انکار بھی نہیں کیا ہے۔ محققین صوفیاء کا بھی خیال یہی ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، صاحب "روح البیان" نبوتِ خضر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "والجمهور على انه نبي غير مرسل وعند الصوفية المحققين ولي غير نبي"(۱) —— یعنی جمہور کے نزدیک حضرتِ خضر نبی غیر مرسل تھے، اور محققین صوفیاء کے نزدیک ولی غیر نبی ہیں۔ یہی رائے علامہ بدر الدین عینیؒ کی ہے(۲)۔

اور جب فرشتہ تھے تو نبی ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اسلئے کہ نص قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ہمیشہ فرد بشر کو دی گئی ہے، کوئی فرشتہ نبی بنا کر انسانیت کی ہدایت کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری ج ۶ کے اندر کعب احبار سے نقل کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے چار زندہ ہیں، جو اہل زمین کے لئے امانت ہیں، ان میں سے دو روئے زمین پر زندہ ہیں خضر اور الیاس اور دو آسمان میں حضرت ادریس اور عیسیٰ علیہما السلام اور عقبہ و بغوی نے نقل کیا کہ اکثر اہل علم کے نزدیک حضرت خضر نبی تھے، البتہ ان کے رسول ہونے میں اختلاف ہے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ ولی تھے، قشیری کی یہی رائے ہے

(۱) روح البیان، ص ۲۹۸، ج ۲۔ (۲) عمدۃ القاری، ص ۳۰۴، ج ۲۔ (۳) فتح الباری ص ۳۰۹، ج ۶۔

اور امام قرطبی کا قول نقل کیا کہ حضرت خضر کی نبوت جمہور کے نزدیک مسلم ہے اور آیت قرآنی بھی ان کے نبی ہونے کی ہی شہادت دیتی ہے، اسلئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم انبیاء میں سے ہیں، انہیں حکم دیا گیا کہ حضرت خضر سے ملاقات کر کے علم حاصل کریں اور ظاہر ہے کہ نبی کو غیر نبی سے علم سیکھنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا، نیز ان کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علوم باطنی سے نوازا تھا، اور ظاہر ہے کہ غیر نبی علوم باطنی پر مطلع نہیں ہو سکتا۔

علامہ محمود آلوسی حنفی روح المعانی[1] میں نبوت خضر کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حضرت خضر نبی غیر رسول تھے اور کہا گیا ہے کہ وہ رسول تھے اور بعض نے کہا کہ وہ ولی تھے، یہی قشیری اور ایک جماعت کی رائے ہے اور مذہب منصور وہ ہے جس پر جمہور ہیں اور اس کے شواہد آیات واحادیث سے بے شمار ہیں اور ان کے مجموعے سے علم یقینی کا حصول ہوتا ہے۔"

علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت کو قرآن کی چند آیات سے ثابت کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"اور قصہ کا سیاق وسباق بھی بہ چند وجوہ حضرت خضر کی نبوت پر دلالت کرتا ہے ان میں سے ایک اللہ سبحانہ تعالیٰ کا قول (پھر ان دونوں نے پایا، ایک بندہ ہمارے بندوں میں کا جس کو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھلایا تھا اپنے پاس سے ایک علم) دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول حضرت خضر سے (کیا میں تیرے ساتھ رہوں، اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ، بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، اور کیونکر ٹھہرے گا، دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو میں نہیں اس کا سمجھنا، کہا تو پائے گا، اگر اللہ نے چاہا مجھ کو

---

(۱) روح المعانی، ص ۳۱۹، ج ۱۵۔

ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا کوئی حکم، بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو مت پوچھیو مجھ سے کوئی چیز میں شروع نہ کروں تیرے آگے اس کا ذکر پس اگر حضرت خضر ولی ہوتے اور نبی نہ ہوتے تو حضرتِ موسیٰ انہیں اس طرح خطاب نہیں کرتے اور نہ خضر حضرت موسیٰؑ کو اس طرح کا جواب دیتے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس وجہ سے ان کی صحبت میں رہنے کی درخواست کی تاکہ حاصل کریں ان سے وہ علم جس کے ساتھ اللہ نے انہیں مخصوص کیا ہے اور خود انہیں وہ علم نہیں دیا گیا لہٰذا اگر خضر غیر نبی ہوتے تو لا محالہ معصوم نہیں ہوتے، اور نہ ان کے پاس جانے کا عزم مصمم کرتے اور نہ ان کے تلاش کی فکر کرتے، اگرچہ ان کی تلاش میں ایک لمبا زمانہ گذر جائے۔ "حقب" کی بعض نے اسّی سال سے تفسیر کی ہے، پھر حضرت موسیٰ جب خضر سے ملے تو تواضع اختیار کی اور ان کی تعظیم و توقیر کی اور ایک طالب علم اور مستفید کی صورت میں ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ خضر بھی حضرت موسیٰ کی طرح نبی تھے اور جس طرح ان کے پاس وحی الٰہی آتی تھی، حضرت خضر کے پاس بھی آتی تھی۔ مگر اللہ نے انہیں کچھ علوم دنیویہ اور اسرارِ نبوت سے آگاہ کر رکھا تھا جس پر حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو بھی مطلع نہیں کیا تھا، حضرتِ خضر کی نبوت پر بعینہٖ اسی طرح رمانی نے بھی استدلال کیا ہے، تیسرے یہ کہ حضرت خضر نے اس نابالغ لڑکے کے قتل پر اقدام کیا اور یہ چیز وحی الٰہی کے ذریعہ ہی انجام دی جاسکتی ہے اور یہ مستقل ان کے نبوت اور ان کے عصمت کی کھلی دلیل ہے، اسلئے کہ ولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ محض قلب میں اس طرح کا خیال پیدا ہونے سے کسی جان کے قتل پر اقدام کرے، کیوں کہ ولی کا قلب و دل واجب العصمۃ نہیں

بنا بریں ولی سے خطاء کا صادر ہونا بالاتفاق جائز ہے اور جب حضرت خضر نے اس لڑکے کے قتل پر اقدام کیا جو ابھی بالغ بھی نہیں ہوا تھا، اس بات کو جانتے ہوئے کہ جب وہ لڑکا سنِ بلوغ کو پہونچے گا تو کفر اختیار کرے گا اور

اپنے والدین کو بھی کفر اختیار کرنے پر ابھارے گا اور شدتِ محبت و رافت کی وجہ سے ان کے والدین بھی اس کی پیروی کرلیں گے، پس اس لڑکے کے قتل کرنے میں بڑی مصلحت تھی جو اس کی زندگی کے بچانے سے بڑھ کر تھی اس کے والدین کو کفر سے بچانے کے لئے اور اس کفر کی عقوبت سے تو یہ اقدام علی القتل ان کی نبوت کی دلیل بنا اور یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے مدد کئے گئے ہیں اس کی عصمت کے ذریعہ، اور میں نے دیکھا کہ شیخ ابو الفرج ابن جوزی نے بھی اسی کی تصحیح کی ہے، اور رمانی سے بھی اسی طرح کا احتجاج منقول ہے، چوتھی بات یہ ہے کہ جب حضرت خضر نے اپنے ان امور کی تفسیر حضرت موسیٰ سے بیان کی اور حقیقت امر واضح کیا تو اس سب کے اخیر میں فرمایا کہ میں نے یہ سب اپنی مرضی اور اپنی طبیعت سے نہیں کیا، بلکہ یہ سب تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا پس یہ تمام چیزیں حضرت خضر کی نبوت پر دال ہیں(۱)۔"

حضرت خضر کی نبوت کے متعلق محقق علامہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی فرماتے ہیں:۔

"راجح قول یہ ہے کہ وہ نبی تھے، اسلئے کہ قرآن عزیز نے جس انداز میں ان کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقامِ نبوت ہی پر صادق آتا ہے اور مقامِ ولایت اس سے بہت فروتر ہے۔ مثلاً جب خضر نے لڑکے کے قتل کی وجہ بیان کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا (رحمة من ربك وما فعلته عن امری) یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا، تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لئے جائز نہیں کہ وہ الہام کے ذریعہ کسی شخص کو قتل کر ڈالے، اسلئے کہ "الہام" میں مغالطہ کا امکان ہے اور اولیاء اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی لئے کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنا پر وہ شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۳۲۸۔

لہٰذا امورِ تکوینیہ میں سے ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے، صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا تھا، اس آیت کے علاوہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے درمیان گفتگو کے واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی تو حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرت خضر کی معیت اور ان کے علم تکوینی کے مشاہدہ کے لئے اصرار کرتے اور تب ہی حضرت خضر جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرتِ موسیٰ ؑ کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں، تاہم مجموعۂ کمالاتِ نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام حضرت خضر ؑ کے مقام سے بہت بلند ہے، کیونکہ وہ خدا کے نبی بھی ہیں اور جلیل القدر رسول بھی، صاحبِ شریعت بھی ہیں اور صاحبِ کتاب بھی اور رسولوں میں بھی اولوالعزم رسول ہیں۔ پس حضرتِ خضر کا وہ جزئی علم جو علم تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جامع علم تشریعی پر فائق نہیں ہو سکتا۔[1]"

خلاصہ یہ کہ قرآنِ کریم نے حضرتِ خضر کے متعلق یہ بھی واضح نہیں کیا کہ وہ کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جمہور علمائے امت کے نزدیک حضرت خضر کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے حضرت موسیٰ ؑ کی معیت میں اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں ان میں سے بعض تو قطعی اور یقینی طور پر خلاف شرع ہیں اور ظاہر ہے کہ حکم شریعت سے کوئی استثنا، بجز وحی الٰہی کے ہو نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اولیاء اور خدا کے نیک بندوں کو بھی بذریعہ کشف و الہام بعض امورِ غیبیہ کا علم ہو جاتا ہے، مگر شریعت میں کشف و الہام حجت نہیں، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا، مثلاً حضرت خضر نے دورانِ سفر ایک نابالغ بچے کو قتل کر دیا، جو بظاہر مخالف شرع ہے، ہر مذہب میں قتلِ نفوس

(۱) قصص القرآن، ص ۵۴۴، ۵۴۵، ج ۱

انسانی کو بلا وجہ شرعی حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے، اسی طرح انہوں نے کشتی میں سوار ہوتے وقت کشتی میں سوراخ کر ڈالا۔ اسلئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام ولی نہیں، بلکہ اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام ایسے دئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، لہٰذا جو کچھ بھی انہوں نے کیا وحی الٰہی اور حکم خداوندی کے تحت کیا، خود ان کی طرف سے بھی اس کا اظہار قرآن کریم کے اس جملے میں ہو گیا (وما فعلته عن امری) یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الٰہی سے کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت خضر جمہور امت کے نزدیک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں منجانب اللہ سپرد کی گئی تھی جن کا انہیں علم دیا گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی تھی اور یہی وجہ ہوئی ان کے اعتراض کرنے کی

حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا انکی وفات ہو چکی

قرآن مقدس میں حضرت خضر علیہ السلام کا جو واقعہ مذکور ہے، اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن و حدیث میں حضرت خضر کی حیات و وفات کے سلسلے میں کوئی صریح اور واضح بات مذکور نہیں، بعض روایات سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بالخصوص زیارت خضر کے سلسلے میں صوفیاء کے اس قدر مشاہدات و اخبار منقول ہوتے آرہے ہیں، جن کا احاطہ دشمار ناممکن ہے، مگر بعض روایات صحیحہ اور آیاتِ قرآنی سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت خضر اپنی زندگی پوری کر کے وفات پاچکے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ علمائے امت کی رائیں مختلف رہی ہیں۔

ابن صلاح کی رائے یہ ہے کہ جمہور علماء حیاتِ خضر کے قائل ہیں اور علماء کی اکثریت ان کی ہم خیال ہے اور صرف بعض محدثین حیاتِ خضر کے منکر ہیں، امام نووی شارح مسلم کا بھی یہی خیال ہے، بلکہ امام نووی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حیاتِ خضر صوفیاء اور اہلِ صلاح و تقویٰ علماء کے مابین مسلم ہے۔ مگر اس سلسلے میں حق یہ ہے کہ جمہور حیاتِ خضر کے قائل نہیں ہیں،

اور اسی مسلک کو آیات واحادیث سے ترجیح ملتی ہے، حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ حیاتِ خضر کے بارے میں جتنے مشاہدات اور اخبار وآثار منقول ہیں ان میں سے اکثر قابلِ حجت نہیں۔

قائلین حیاتِ خضر کے استدلال

جو حضرات حیاتِ خضر کے قائل ہیں ان کا استدلال واحتجاج ایک تو اس حدیث سے ہے، جس کو حاکم نے اپنی مستدرک میں صحابی رسول حضرت انس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے کمرے میں داخل ہوئے اور لوگوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر پہونچے اور زار وقطار رونے لگے پھر صحابۂ کرامؓ کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات ارشاد فرمائے۔

"اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلا ہے، ہر فوت ہونے والی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے، ہر ہلاک ہونے والے کا، اسلئے اسی کی طرف رجوع کرو، اسی کی طرف رغبت کرو، کیونکہ محروم وہ شخص ہے، جو مصیبت کے ثواب سے محروم ہو جائے۔"

یہ کلمات مذکورہ کہہ کر وہ آنے والے شخص رخصت ہو گئے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام تھے، جو ہماری تعزیت کے لئے حاضر ہوئے تھے امام جزری نے حصن حصین میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ دجال مدینہ طیبہ کے قریب تک پہونچے گا تو مدینہ طیبہ سے ایک شخص اس دشمنِ خدا کے مقابلہ کے لئے نکلے گا جو اس زمانہ کے سب لوگوں میں بہتر ہو گا، تو ابو اسحٰق نے اس حدیث کے تحت فرمایا کہ وہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (تفسیر قرطبی) اور دارِ قطنی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ خضر آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے ہیں، اللہ نے ان کی عمر میں زیادتی کر دی ہے، وہ دجال کی تکذیب کریں گے۔ اس روایت سے بھی حیاتِ خضر کے قائلین کو سہارا ملتا ہے۔

اور ابن ابی الدنیا نے "کتاب المواقیف" میں اور خطیب بغدادی وحافظ

ابن عساکر وغیرہم[۱] نے اپنی سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو خضر علیہ السلام نے ان کو ایک دعا بتلائی کہ جو اسے ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہے۔ وہ دعا یہ ہے:

یا من لا یشغلہ سمع عن سمع ویا من لاتغلطہ المسائل ویا من لا یتبرم من الحاح الملحین اذقنی برد عفوك وحلاوۃ مغفرتک۔

اے وہ ذات جس کو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا، اور اے وہ ذات جس کو دعا میں الحاح واقرار کرنے اور بار بار کہنے سے ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عفو وکرم کا مزہ چکھادے اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرما۔

اور حافظ ابن عساکر نے یہ بھی روایت کیا کہ حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال ماہِ رمضان کا روزہ بیت المقدس میں رکھتے ہیں اور ہر سال دونوں صاحبان حج کو جاتے ہیں، اور دورانِ حج دونوں ماءِ زمزم اس قدر پی لیتے ہیں جو انہیں آئندہ سال تک کفایت کرتا ہے، اسی طرح اولیاءِ امت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں، جنہیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں، اس طرح کے واقعات وحکایات ملاحظہ کرنے کے لئے البدایہ والنہایہ کی جلد اول اور الاصابہ اور تفسیر قرطبی کی طرف رجوع کیا جائے۔

منکرین حیاتِ خضر کے استدلال

ابو حیان نے تفسیر بحر محیط[۲] میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے

(۱) روح المعانی ص ۳۱۹، ج ۱۵۔ تفسیر قرطبی، ج ۶، حالاتِ خضر کے تحت۔

(۲) بحر محیط، ص ۱۴۷، ج ۶۔

ملاقات کے نقل کئے ہیں، مگر ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ: "والجمہور علی انہ مات" یعنی جمہور علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔ علامہ محمود آلوسیؒ[1] نے نقل فرمایا کہ عراقی نے تخریج احادیث احیاء میں اس بات کی تصریح کی ہے۔ جو محدثین عظام حیاتِ خضر کے قائل ہیں ان کا اس بات پر اجماع منعقد ہوگیا ہے کہ حیاتِ خضر کے سلسلے میں کوئی مرفوع روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ[2] لکھتے ہیں کہ ابن عطیہ نے کہا کہ حیاتِ خضر کے متعلق جتنے اخبار وآثار منقول ہیں ان میں سے کوئی بھی قابلِ حجت و سند نہیں، چند سطروں کے بعد ان حکایاتِ ضعیفہ کو نقل کر کے فیصلہ کن بات تحریر فرماتے ہیں: "وکذالک فیہ حکایات واحادیث اکثرھا لا تقوم حجۃ" یعنی حیاتِ خضر کے سلسلے میں اسی طرح کی بہت سی حکایات واحادیث منقول ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حجت کے لائق نہیں۔

اس کے علاوہ خود قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر وفات پا چکے اور ان کو حیاتِ ابدی حاصل نہیں۔ قرآنِ مقدس میں ہے کہ: "وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد" اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تم سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ ابدی عطا نہیں کی۔

سرتاج محدثین امام بخاری سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس باحیات ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں کیسے زندہ رہیں گے، جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے چند دنوں قبل ارشاد فرمایا کہ موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی سو سال بعد زندہ نہیں رہے گا اور پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد

نیز قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء کرامؑ سے یہ عہد و میثاق لیا کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو تم میں سے جو بھی اس وقت موجود ہو اس کا فرض ہوگا کہ وہ اس رسول پر ایمان بھی لائے اور اس کی نصرت وحمایت بھی کرے۔

---

(۱) روح المعانی، ص ۳۱۹ تا ۳۳۰ - ج ۱۵ - (۲) فتح الباری، ص ۳۰۹، ۳۰۸، ج ۶

چنانچہ تمام انبیاء و رسل نے اس کا اقرار کیا۔

"اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر عہد قبول کیا، بولے ہم نے اقرار کیا، پھر تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، یعنی اللہ تعالےٰ نے یہ عہد تمام انبیاء علیہم السلام سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید و حمایت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی اس کی ہدایت کر جائیں کہ اگر وہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی نصرت و حمایت کریں۔

پس اگر حضرت خضر زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں شریک ہو کر آپ کی اعانت و امداد کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت خضرؑ حاضر خدمت ہو کر آپ پر ایمان لائے ہوں، یا کسی غزوہ میں شریک رہے ہوں، حالانکہ غزوۂ بدر و حنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور دیگر ملائکہ کی اعانت و نصرت کی تصریحات کتب احادیث میں موجود ہیں،

اسی طرح غزوۂ بدر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باری تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا: اللّٰھم ان تھلک ھٰذہٖ العصابۃ لا تعبد فی الارض۔ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر روئے زمین پر کوئی تیری پرستش کرنے والا نہ رہے گا اگر حضرت خضر ان دنوں باحیات ہوتے تو آپؐ اس طرح کا جملہ کیوں ارشاد فرماتے؟

قرآن کریم کی ان آیات کے علاوہ صحیحین کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ حضرت خضر اب تک زندہ ہیں۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے ——— وہ فرماتے ہیں کہ

ایک رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخر حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد خلاف معمول آپ کھڑے ہو گئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے :

"میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ آج کی رات تم سے جو اس سرزمین پر موجود ہے، سو سال گذرنے کے بعد کوئی ان میں سے زندہ نہیں رہے گا۔"

اور امام احمدؒ نے اسی حدیث کو جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، مگر اس کے الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں، حضرت جابر فرماتے ہیں:

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ دنوں یا ایک ماہ قبل ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی آج زندہ ہے سو سال بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشنگوئی کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام کی حیاتِ ابدی کیلئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی ہے، یہی حدیث مختلف طریقوں سے دوسری کتب احادیث میں بھی منقول ہے، مگر کسی میں بھی حضرت خضرؑ کا استثناء نہیں ہے۔ اگر حضرت خضر کو حیاتِ ابدی حاصل ہوتی تو قرآن و حدیث میں اس کی صراحت ضرور ہوتی۔ تفسیر مظہری میں[1] حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکاشفہ سے فرمایا کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالم کشف میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہما السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ کا مکاشفہ اگرچہ حجت شرعی نہیں، لیکن اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر وفات خضر علیہ السلام کے سلسلے میں اشکال ہی باقی نہیں رہے گا۔ تمام احادیث جن سے ان کی وفات صحیح کا ثبوت ملتا ہے اور مکاشفاتِ صوفیاء جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ کو حیاتِ ابدی حاصل ہے اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہو جائے گی۔

---

(۱) تفسیر مظہری۔

علامہ محمود آلوسی نے وفاتِ خضر کے دلائل نقلیہ کے ساتھ دلائل عقلیہ سے بھی اسے مدلل و مبرہن کیا ہے تحریر فرماتے ہیں :

" اور ہمارے پاس حضرت خضر کے وفات پا جانے پر عقلی دلائل بھی موجود ہیں، ان دلائل عقلیہ میں سے ایک یہ ہے کہ جو لوگ حیاتِ خضر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حضرت خضر آدم علیہ السلام کے حقیقی بیٹے ہیں اور یہ بدو وجہ فاسد ہے، وجہ اوّل یہ کہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ حضرت خضر کی عمر چھ ہزار سال یا اس سے بھی زائد ہو، اور اس طرح کی عمر عام طور پر انسانوں کو نہیں ملتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر وہ آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے، یا ان کی چوتھی پشت میں ہوں، جیسا کہ قائلینِ حیاتِ خضر کا گمان ہے کہ حضرت خضر ذوالقرنین کے وزیر تھے ....

اور دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر حضرت خضرؑ نوح علیہ السلام سے پہلے ہوئے تو ان کے ساتھ ضرور کشتی میں سوار ہوئے اور ان کے کشتی میں سوار ہونے کو کسی نے نقل نہیں کیا۔ دلیل سوم یہ ہے کہ علمائے امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام طوفان ختم ہو جانے کے بعد کشتی سے باہر آگئے تو ان کے ساتھ جو لوگ بھی تھے سب کا انتقال ہو گیا اور صرف ان کی نسل باقی رہ گئی اور اس کی دلیل اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وجعلنا ذریته هم الباقین (اور ہم نے کر دیا انہیں کی اولاد کو باقی رہنے والی) چہارم یہ کہ اگر کسی انسان کا آدم علیہ السلام سے لے کر نظامِ کائنات کے درہم برہم ہونے تک زندہ رہنا ثابت و صحیح ہوتا تو یہ اللہ کی عظیم نشانیوں اور عجائباتِ قدرت سے ہوتا اور اس کی خبر قرآن پاک میں متعدد مقامات میں مذکور ہوتی، کیونکہ اس کا اتنے طویل زمانے تک باقی رہنا خدائی ربوبیت کی مزید نشانی ہوتی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس بندے کا ذکر کیا ہے، جسے اس نے ساڑھے نو سو سال تک زندہ رکھا تھا (مراد حضرت نوح علیہ السلام) ہیں اور اسے اپنی قدرت کی نشانی و علامت قرار دیا۔ پس کیونکر اس شخص کا ذکر نہ کرتا جسے اس نے ہمیشگی زندگی عطا

فرمائی۔ پنجم یہ کہ حیاتِ خضر کا عقیدہ اختیار کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ پر بغیر علم کے تہمت باندھنا ہے اور ایسا کرنا نص قرآنی سے حرام ہے۔ بہرحال مقدمہ ثانیہ تو وہ بالکل ظاہر ہے اور مقدمہ اولیٰ یہ ہے کہ اگر حیاتِ خضر کا ثبوت ہوتا تو ضرور اس پر قرآن و حدیث اور اجماعِ امت سے دلیل ملتی۔ پس دیکھو یہ اللہ کی کتاب ہے کہاں اس میں (صراحۃً یا کنایۃً) حیاتِ خضر کا ذکر ہے، اور لو یہ اللہ کے رسول کی سنت ہے، کہاں اس میں حیاتِ خضر پر دلالت کرنے والی کوئی چیز ہے اور یہ علمائے امت ہیں، پس کب انہوں نے حیاتِ خضر پر اجماع کیا۔ ششم یہ کہ زیادہ سے زیادہ جس چیز سے حیاتِ خضر پر استدلال و احتجاج کیا جاتا ہے وہ چند واقعات و حکایات ہیں جو ایک دوسرے سے منقول ہوتے آرہے ہیں، جس کے ذریعہ آدمی خبر دیتا ہے کہ اس نے خضرؑ کو دیکھا ہے، پس خدا ہی کے لئے تعجب ہے، کیا حضرت خضر کی کوئی خاص علامت و نشانی ہے، جس کے ذریعہ دیکھنے والا انہیں پہچان لیتا ہے اور بہت سے لوگ جنہیں ان کی رویت کا گمان ہے دھوکہ کھا جاتے ہیں اس کے قول سے کہ میں خضر ہوں اور یہ بات معلوم ہے کہ کسی قائل کی تصدیق جائز نہیں ہے، جب تک کہ اس کی کوئی دلیل اللہ کی طرف سے نہ مل جائے۔ پس کہاں سے دیکھنے والے کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مخبر صادق ہے جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ ہفتم امت کا اس پر اجماع منعقد ہوگیا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ میں خضر ہوں، اگر وہ کہے کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ یہ حدیثیں سنی ہیں، تو اس کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس سے دینی امور میں احتجاج درست ہوگا۔ اور قائلین حیاتِ خضر کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ یہ کہیں کہ "حضرت خضر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف نہیں لائے اور نہ آپ سے بیعت کی" نیز جو محدثین حیاتِ خضر کے قائل ہیں، ان کا اس پر اتفاق ہے کہ حیاتِ خضر کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت ثابت نہیں ہے، جیسا کہ عراقی نے تصریح کی ہے۔"

حیاتِ خضر یا وفاتِ خضر کا مسئلہ اعتقادیات میں سے نہیں ہے اور نہ اس کے اقرار و انکار

سے ایمان پر کوئی زد پڑتی ہے، لہٰذا طول وطویل بحث وتحمیص میں پڑنے کی چنداں حاجت وضرورت نہیں۔ تاہم اس سلسلے میں دلائل وبراہین سے جو مسئلہ نکھر کر سامنے آتا ہے اور جس کی طرف آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ سے رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حیاتِ ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی مدتِ حیات پوری کر کے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ چنانچہ محقق علامہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی قصص القرآن میں لکھتے ہیں:-

صحیح رائے علمائے محققین ہی کی ہے، جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرتِ خضر کو حیاتِ ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے۔ اس لئے کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کسی بھی انسان کو حیاتِ ابدی عطا نہیں فرمائی اور اس کے لئے دنیا میں "موت" ایک امرِ حق ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وماجعلنا لبشر من قبلك الخلد" (انبیاء) اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تم سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ ابدی عطا نہیں کی۔ نیز قرآن پاک میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گی تو تم میں سے جو بھی اس وقت موجود ہو اس کا فرض ہو گا کہ وہ اس رسولؐ پر ایمان بھی لائے اور اس کی مدد بھی کرے۔ چنانچہ تمام انبیاء ورسل نے اس کا اقرار کیا اور ان کے اور خدا کے درمیان شہادت ومیثاق محکم ومضبوط ہوا

"اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق وعہد لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے، پھر آوے تمہارے پاس رسول (محمد) کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا، فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

پس اگر حضرت خضر زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضر خدمت ہو کر آپؐ پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں آپؐ کی امداد واعانت کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے ان باتوں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ غزوۂ بدر وحنین وغیرہ میں جبریل امین اور ملائکہ کی امداد واعانت کی تصریحات موجود ہیں۔

قرآن عزیز کی ان آیتوں کے علاوہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدے کی تردید کرتی ہے کہ خضر اب تک زندہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عشار کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقید حیات ہے ایک صدی گزرنے پر ان میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہ رہے گا۔

اس صحیح حدیث کی پیش گوئی کے مطابق حضرت خضرؑ کی حیات ابدی کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی ہے اور نہ ان کا استثنا کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتب حدیث میں بھی منقول ہے، اسی لئے مشہور محدث حافظ ابن قیم نے یہ دعوی کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے ایک بھی صحیح روایت منقول نہیں ہے، جس سے حضرت خضر کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ اس کے برعکس آیات قرآنی اور صحیح روایات ان کی موت کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن جوزی، امام بخاری، قاضی ابو العلی حنفی، ابوطاہر بن الغباری، علی بن موسی الرضا، ابو الفضل مرسی، ابوطاہر بن العبادی، ابو الفضل بن ناصر، قاضی ابو بکر بن العربی، ابو بکر محمد بن الحسن جیسے جلیل القدر محدثین ومفسرین ان کی موت ہی کے قائل ہیں۔

لہٰذا حیات خضر کے متعلق جن علماء نے اجماع نقل کیا ہے وہ قطعاً بے سند ہے، بلکہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی نے دعوائے اجماع کے خلاف یہ دعوی کیا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ حضرت خضر زندہ نہیں ہیں۔ (قص القرآن ص ۴۵ تا ۵۴، ج ۱)

مولوی اشرف علی قاسمی (تخصص فی الفقہ)

جمع قرآن اور مستشرقین کے بعض شبہات

قرآن پاک کلام الٰہی اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ وہ کتاب ہے جو قیامت تک آنے والی نسل کے لئے ہدایات کا ذریعہ ہے، جو انسانی زندگی کے ہر موڑ اور ہر قدم پر اور تمام مسائل میں رہنمائی کے لئے اپنے اندر احکام و ہدایت کو سموئے ہوئے ہے، جو ان فرامین الٰہی کا مجموعہ ہے، جس میں انسان کے ہر شعبۂ حیات کے لئے تعلیمات موجود ہیں، جس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے حق میں اللہ تعالےٰ نے "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" فرماتے ہوئے خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔

مغربی مصنفین اور مغربی تہذیب کے علم برداروں نے جہاں اسلام کی تعلیمات اور اس کے احکام کو اعتراض و تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہیں قرآن پاک بھی ان کے اعتراضات سے نہ بچ سکا، ان کے اسلام دشمنی کے جذبہ نے قرآن جیسے ابدی کلام پر بھی اعتراض و تنقید کرنا نہ چھوڑا، ان کا اعتراض ہے کہ قرآن زمانۂ نبوت کے ایک عرصہ بعد مرتب کیا گیا ہے، اس لئے یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن اسی شکل میں موجود ہو، جو محمد (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) نے اپنے متبعین کو بتائی تھی اور یہ بھی احتمال ہے کہ اتنے زمانہ کے بعد ترتیب کی وجہ سے قرآن میں تحریف ہوگئی ہو۔ اور اسی طرح کے دوسرے اعتراضات قرآن پاک پر کئے گئے ہیں ——— راقم سطور کو یہی بات واضح کرنی ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب لوحِ محفوظ ہی کے مطابق ہے، اس میں ایک حرف اور ایک شوشہ بھی تحریف شدہ نہیں ہے، اور قرآن پر مخالفین کے اعتراضات تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک نظر قرآن کے جمع و ترتیب کی تاریخ پر ڈالیں۔

نزولِ قرآن کی ابتداء

آپ اپنی عمر کی چالیس بہاریں دیکھ چکے تھے، غار حرا میں تشریف لے جانا اور ہفتوں معرفت

خداوندی میں گم رہنا آپؐ کا معمول بن گیا تھا، معمول کے مطابق غارِ حرا میں تھے، کہ بارگاہ خداوندی کے مقرب فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام دربار الٰہی سے ربِ دوجہاں کا پہلا پیغام لے کر آئے اور مژدۂ نبوت سنایا:

اقرأ باسم ربك الذی خلق ہ خلق الانسان من علق ہ اقرأ وربك الاکرم ہ الذی علم بالقلم ہ علم الانسان مالم یعلم ہ (العلق ع ۱۔۲)

آپؐ اپنے رب کے نام سے پڑھیئے، جس نے (سارے عالم کو) پیدا کیا اور انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپؐ پڑھیئے آپؐ کا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم سے سکھایا اور انسان کو ناواقف باتوں سے واقف کرایا۔

اس کے بعد قرآن کے نزول کا سلسلہ ۲۳ سالوں تک وقفہ وقفہ سے مسلسل جاری رہا، ان میں وہ ہدایات تھیں، جن میں انسانیت کی فلاح وکامرانی مضمر تھی، انہیں کو تحریری شکل دینے کیلئے اپنے اصحاب میں سے چند خوشخط اور اہلِ فہم کا انتخاب فرمایا، ان کاتبینِ وحی میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، خالد بن ولیدؓ، ابوہریرہؓ، عمر بن العاصؓ اور عبداللہ بن عمرؓ جیسے اہلِ علم اور جلیل القدر صحابہؓ تھے، قرآن پاک کی کسی آیت کے نازل ہونے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان حضرات کو بلاتے اور نازل شدہ آیات تحریر کروا دیتے، صحابہؓ ان آیتوں کو حفظ بھی کر لیا کرتے، اس طرح زمانۂ نبوت میں قرآن مجید صحائف کی صورت میں بھی محفوظ تھا، اور بہت سے صحابہؓ اس کو حفظ بھی کر چکے تھے۔

جمع قرآن اور اس کے ادوار

عہدِ نبوی ؐ میں قرآن کے اجزاء متفرق تھے اور مختلف لوگوں کے پاس مختلف حصوں کے نوشتے تھے، یہ مجموعی شکل میں امت کے سامنے کس طرح آیا؟ اس سلسلے میں علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان" میں خاصی بحث کی ہے اور انہوں نے جمع قرآن کے تین ادوار کئے ہیں (۱) عہدِ نبوی (۲) عہدِ صدیقی (۳) عہدِ عثمانی۔

جہاں تک عہدِ نبوی ؐ کی بات ہے تو جیسا کہ بیان کیا گیا کہ صحابہؓ نے قرآن کو مختلف حصوں اور مختلف چیزوں پر لکھا اور اسے محفوظ کر رکھا تھا، قرآن کے بعض حصے پتھر پر، بعض کھال پر، بعض کھجور کی چھالوں

اور بعض جھلیوں وغیرہ پر لکھے ہوئے تھے، خود کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ زمانۂ نبوت میں ہم قرآن کو لکھا کرتے تھے: کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع[1] ——— گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہؓ نے قرآن کے جمع کرنے اور مختلف اشیاء پر لکھنے کا خاصا اہتمام کیا تھا۔

عہد صدیقی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو اس وقت ارتداد کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، کئی جھوٹے مدعیانِ نبوت بھی اپنے نبی ہونے کے دعویدار بن بیٹھے ایک طرف اسود عنسی صنعاء سے اٹھ کھڑا ہوا، تو دوسری طرف مسیلمہ کذاب نے یمامہ سے اپنی نبوت کا بگل بجایا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہی ان فتنوں کے مقابلہ اور سر کوبی کے لئے ہر طرف لشکر اسلام روانہ فرمائے اور خدا کی نصرت و مدد سے خود ساختہ نبوت اور بغاوت کے یہ چھوٹے سیاہ بادل بہت جلد چھٹ گئے، البتہ اس میں ایک بڑا خسارہ یہ ہوا کہ حفاظِ قرآن کی بڑی جماعت شہید ہو گئی اور قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی رائے کی موافقت میں کئی آیات نازل ہو چکی تھیں انہیں اس واقعہ نے تڑپا دیا، خلیفۃ المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ یمامہ کی خون ریز جنگ میں حفاظِ قرآن کی بڑی جماعت شہید ہو گئی ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ قرآن کو یک جا جمع کرنے کا حکم صادر فرما دیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کام کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ اس کام میں خیر ہی خیر ہے حضرت عمرؓ اصرار کرتے رہے اور آپ انکار کرتے رہے یہاں تک کہ بالآخر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہ بھی اس کام کے لئے تیار ہو گئے، اس اہم فریضہ کی انجام دہی

---

(۱) روح المعانی، ج ۱/۲۱۔

کے لئے انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور ان سے فرمایا:

"آپ ایک نوجوان اور ذی شعور انسان ہیں، ہم آپ کے بارے میں کوئی بد گمانی نہیں رکھتے، آپ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے "کاتب وحی" رہ چکے ہیں، اس لئے میری یہ خواہش ہے کہ قرآن کے منتشر حصوں کو تلاش کر کر کے جمع کریں"۔[1]

اس عزم کو سن کر انہوں نے بھی اپنے ذہنی خلجان کا اظہار کیا کہ آپ اس نازک کام کو کیسے انجام دیں گے، جس کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں نہیں کیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس میں بڑا خیر مضمر ہے، اس طرح حضرت ابو بکرؓ کے اصرار پر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہ جمع قرآن کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح اس اہم کام کی ذمہ داری کا بار حضرت زیدؓ کے سر رکھا گیا۔ جب یہ ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی تو انہوں نے فرمایا:

فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ماکان اثقل علیّ مما امرنی من جمع القرآن[2]!	خدا کی قسم اگر یہ لوگ ایک پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو جمع قرآن کی ذمہ داری سے میرے لئے یہ زیادہ آسان تھی۔

پھر مدینہ کی گلیوں اور مضافات میں اعلان عام کر دیا گیا کہ جن کے پاس قرآن کا کوئی حصّہ موجود ہو وہ لے کر آجائیں، نیز حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھنے پر مامور کیا گیا کہ قرآن کے کسی حصہ کو کسی سے دو گواہوں کی شہادت لئے بغیر قبول نہ کریں،

ان ابا بکر قال لعمر و زید: اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاہدین علی شیئٍ فاکتباہ[3] ـــــــــــ "شاہدین" کی تفسیر میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حفظ اور کتابت ہے[4]۔ علامہ سخاویؒ نے فرمایا کہ "شاہدین" سے مراد ایسے دو گواہ ہیں،

---

(۱) الاتقان ۱/۱۶۷، روح المعانی ۱/۲۱، ۲۲۔

(۲) تفسیر قرطبی ۱/۵۰۔

(۳) الاتقان فی علوم القرآن ۱/۱۶۷۔ (۴) حوالہ سابقہ

جو پیش شدہ آیت یا سورت کے بارے میں جزو قرآن ہونے کی شہادت دیں"۔[1] ابو شامہ کہتے ہیں کہ اس اعلان کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھے گئے حصہ کا اہتمام کروانا تھا، تاکہ صرف حافظہ پر اعتماد کرتے ہوئے نہ لکھا جائے"۔[2]

راقم سطور کا خیال ہے کہ علامہ سخاویؒ کی تشریح زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اس اعلان کے بعد سورہ توبہ کا آخری حصہ صرف حضرت خزیمہؓ کے پاس موجود تھا اور رجم والی آیت حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھی۔ جب ان دونوں نے آیت پیش کی تو حضرت خزیمہؓ کی پیش کردہ آیت قبول کرلی گئی اور حضرت عمرؓ کی پیش کردہ آیت نہیں قبول کی گئی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے مساوی قرار دیا تھا، اسلئے تنہا ان کی پیش کردہ آیت قابلِ قبول سمجھی گئی، بخلاف حضرت عمرؓ کے، کہ ان کے پاس دو شاہد موجود نہیں تھے، اس لئے ان کی پیش کی ہوئی آیت قبول نہیں کی گئی"۔[3] ——— اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "شاہدین" سے دو آدمیوں کی شہادت ہی مراد تھی، حفظ و کتابت مراد نہ تھی، اگر حفظ و کتابت ہی مراد ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حافظہ حضرت خزیمہؓ کے بالمقابل کم نہ تھا ——— حاصل یہ کہ مصحف قرآنی کی ترتیب میں اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا کہ بغیر کسی شہادت کے آیتِ قرآنی قبول نہ کی جاتی تھی، حضرات صحابہؓ کا یہ عمل کمال احتیاط پر مبنی تھا کہ شبہہ کی ادنیٰ گنجائش نہ رہے اور مذاہب کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے!

یہیں سے عیسائیوں کا وہ شبہہ بھی دور ہو جاتا ہے جس کی طرف ابتداء میں اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے قرآن کی کوئی ترتیب نہیں تھی اور اس کا کوئی یقینی اور قابلِ اعتماد نسخہ موجود نہ تھا، ایک عرصہ کے بعد اس کو ترتیب دیا گیا، اس لئے یہ کہنا کیونکر درست ہوگا کہ موجودہ قرآن لوح محفوظ ہی کے مطابق ہے اور اس میں ادنیٰ درجہ کی تحریف بھی نہیں ہے؟ ——— یہ اس لئے غلط ہے کہ اوّل تو حضرت عثمانؓ سے قبل ہی عہدِ صدیقی میں قرآن کو مرتب کرکے حکومتِ اسلامی کے

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ۱/۱۶۷ (۲) ایضاً

(۳) روح المعانی ۱/۲۲۔

سپرد کر دیا گیا تھا، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں مختلف لغات سے صرف لغت قریش پر جمع کروایا گیا تھا، اصل جامع قرآن تو خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، دوسرے خود عہد صدیقی میں ترتیب قرآن میں کس درجہ حزم و احتیاط سے کام لیا گیا تھا اس کا ہلکا سا اندازہ اس طریق کار سے ہو جائے گا جو اوپر مذکور ہوا۔

ایک شبہ کا ازالہ

ان تفصیلات سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کے جامع اوّل، خلیفۂ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، لیکن بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جامع اوّل حضرت علیؓ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں ابن سیرین کی روایت نقل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی قرآن جمع کیا تھا۔[1] ابن حجرؒ نے روایت نقل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حیثیت بھی واضح کر دی ہے کہ یہ روایت سنداً منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کے بالمقابل عبد خیر کی روایت کو "وھو المعتمد" فرما کر قابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے ——— اسی طرح ایک اور روایت نقل کی جاتی ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جامع اوّل ہونے کو واضح کرتی ہے، اس روایت کو بھی ابن حجرؒ نے ضعیف قرار دیتے ہوئے جواب دیا ہے کہ "جمع" سے مراد یہ ہے کہ جمع قرآن کے مشورہ دینے میں اولیت حضرت عمرؓ کو حاصل ہے۔[2]

علامہ سیوطیؒ نے ایک تیسری روایت اور نقل کی ہے، اس میں بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بجائے

---

(۱) اخراج ایضاً من طریق ابن سیرین قال قال علی لما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آلیت لا آخذ ردائی الا لصلوٰۃ الجمعۃ حتی اجمع القرآن فجمعہ وھذا الاثر ضعیف۔ فتح الباری ۹/۱۳ وھو ما اخرجہ غیر واحد من روایۃ ابی حیان التوحیدی احد زنادقۃ الدنیا ہامش روح المعانی ۱/۲۲۔

(۲) ملاحظہ ہو فتح الباری ۹/۱۳ اور علامہ سیوطیؒ کی الاتقان ۱/۶۶۔

سالم مولیٰ ابن حذیفہؓ کو قرآن کا جامع اول ٹھہرایا گیا ہے[1]۔ یہ روایت (جیسا کہ سیوطیؒ نے تصریح کردی ہے) ایک طرف غریب ہے تو دوسری طرف یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ سالم مولیٰ ابی حذیفہ جنگِ یمامہ ہی میں شہید ہوچکے تھے، اسلئے ان کو جامع قرآن قرار دینا کسی طرح قرینِ صواب نظر نہیں آتا[2]۔ کیونکہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ جمع قرآن کا کام جنگِ یمامہ کے بعد ہوا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جامعِ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں، جیسا کہ علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے:

لاشك ان الامر بالجمع من الصديق بعد تلك الوقعة التى كانت سببًا له كما يدل عليه حديث البخارى[3]۔

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہی جمع قرآن کا حکم اس وقت دیا تھا، جب کہ وہ واقعہ (جنگ یمامہ) پیش آچکا تھا، جو جمع قرآن کا سبب بنا، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

اور جن روایتوں سے دوسرے صحابی کا جامع اوّل ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ روایتِ ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

عہد عثمانی اور جمع قرآن

جمع قرآن کا تیسرا دور عہد عثمانی ہے، اس عہد (۲۵ھ) کا سب سے عظیم کارنامہ ہے کہ امت مسلمہ میں اختلاف کو بھانپ کر تمام لغتوں پر باقی رکھنے کی بجائے صرف "لغت قریش" پر جمع کیا گیا جس کا پس منظر یہ ہے کہ عہد عثمانی کی ابتدائی چند سالوں میں عہد فاروقی کی طرح جنگوں اور فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی آرمینیہ اور آذربائیجان سے اہلِ اسلام کی معرکہ آرائی تھی، اس میں جو سب سے اہم واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ اہلِ عراق اور اہلِ شام میں مختلف لغات میں

---

(۱) عن ابی بریدة قال: اوّل من جمع القرآن فی مصحف سالم مولیٰ ابی حذیفة، اقسم لا یرتدی برداء حتی یجمعه فجمعه ثم ائتمروا ما یسمونه فقال بعضهم سموه السفر قال ذلك اسم تسمية اليهود فكرهوه فقال رأيت مثله فی الحبشة يسمى المصحف فاجتمع رأيهم علی ان يسموه المصحف (الاتقان ۱/۱۶۶- (۲) روح المعانی ۱/۲۲- (۳) ایضاً۔

قرآن پڑھنے والے موجود تھے، جب ان کا باہم اختلاط ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے کے انداز تلاوت میں تفاوت پایا اور ان کے مابین نزاع کی سی صورت پیدا ہوگئی، حضرت حذیفہؓ بن یمان اس جنگ میں اس اختلاف کا مشاہدہ کر رہے تھے، جنگ سے واپسی کے بعد حضرت عثمانؓ کی خدمت میں "چشم دید واقعات" سنانے کی غرض سے تشریف لائے اور جنگ میں پیش آمدہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا: ہمیں شدید اندیشہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح امتِ محمدیہ بھی کتاب اللہ میں اختلاف کر کے راہ مستقیم سے کھٹک نہ جائیں، اس لئے میری گذارش ہے کہ امت کے سفینۂ ہدایت کو غرق ہونے سے قبل ہی بچالیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ باہمی اختلاف کی وجہ سے یہ ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جائیں ——— حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت حفصہ سے قرآن مجید کا عہد صدیقی کا مدون نسخہ طلب فرمایا اور زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارثؓ کو مامور کیا، مختلف لغات کی بجائے صرف لغتِ قریش پر قرآن جمع کر دیا جائے، ان میں زید بن ثابتؓ کے علاوہ سبھی قریشی تھے اس لئے یہ بھی ہدایت دی کہ زید بن ثابتؓ کی قرأت ان سے مختلف ہو، تو ان قریشیوں کی قرأت کو ترجیح دی جائے، کیونکہ قرآن اصلاً قریش ہی کی زبان میں نازل کیا گیا ہے، ان صحابہؓ نے بحسن وخوبی اس فریضہ کو انجام دیا۔ ایک دفعہ حضرت زیدؓ اور قریشی صحابہ میں لفظ "تابوت" میں اختلاف ہوگیا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے کہ "تابوہ" ہے اور قریشی صحابہ کی رائے تھی کہ یہ لفظ "تابوت" ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ "قریش کی زبان میں" تابوت" ہی لکھو۔(۱)

پھر لغتِ قریش پر مرتب شدہ نسخۂ قرآن مجید کی مختلف نقلیں کی گئیں اور عالم اسلام کے مختلف علاقوں کو سرکاری طور پر بھیج دیا گیا۔ اور اس کے علاوہ تمام نسخے نذر آتش کر دئے گئے،(۲) تاکہ یہ نسخے باہم نزاع اور اختلاف کا باعث نہ بنیں۔ ایک بڑے فتنہ کا سدِ باب کرنے کی وجہ سے سلف و خلف نے

---

(۱) تفسیر قرطبی ۱/۵۴۔

(۲) واما ترتیب الآیات فانه توقیفی بلا شك ولا خلاف انه من النبی صلی اللہ علیه وسلم وهو امر واجب فقد کان جبرئیل یقول ضع آیة کذا فی موضع کذا۔

(ارشاد الساری ۷/۴۵۵)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا ہے، خود حضرت علیؓ نے فرمایا:

لا تقولوا فی عثمان الا خیراً فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملأ منا۔[1] (حضرت) عثمانؓ کے بارے میں بھلی باتوں کے سوا کچھ نہ کہو، خدا کی قسم مصاحف میں جیسا انہوں نے کیا، وہ ہم صحابہ کے اتفاق ہی سے کیا تھا۔

ایک اور موقعہ پر مزید صراحت کے ساتھ فرمایا:

لو ولیت لعملت بالمصحف الذی عملہ عثمانؓ۔[2] اگر عثمانؓ کی جگہ میں (حکمراں) ہوتا تو ایسی صورت حال میں قرآن کے ساتھ میرا وہی معاملہ ہوتا، جو عثمانؓ کا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کا یہ عمل ان کی فراستِ ایمانی کا مظہر ہے اور وہ اپنے اس عمل پر امت کی طرف سے بہترین جزا کے مستحق ہیں۔

آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے

اب ایک بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیتوں اور سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے یا اجتہادی؟ آیتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے[3]۔ چنانچہ علامہ زرکشی اور ابو جعفر نے آیات کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر اجماع نقل کیا ہے اور ابن بطال نے واضح انداز میں دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ: لاخلاف ان ترتیب آیات کل سورۃ علی ما ھی علیہ الآن فی المصاحف توقیف من اللہ وعلی ذالک نقلتہ الامۃ عن نبیہا[4] ـــــ اس سلسلہ میں استدلال میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں۔ بخاری میں ایک روایت صراحۃً مذکور ہے:

عن ابن الزبیرؓ قال قلت لعثمانؓ (والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا) قد نسختھا الآیۃ الاخریٰ فلم تکتبھا او حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے (حضرت) عثمانؓ سے کہا کہ آیت قرآنی: والذین یتوفون الخ کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے، پھر بھی آپ نے کیوں لکھ دیا، آپؓ

---

(۱) روح المعانی ج ۱، ص ۲۳ (۲) حوالہ سابق

(۳) روح المعانی، ج ۱، ص ۲۹۔ (۴) فتح الباری ج ۹ ۔ ص ۴۰

تدعها قال یا ابن اخی لا اغیر شیئاً۔ (۱) ... ...

(حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: کہ عزیزم! ہمیں اپنی جانب سے قرآن میں کچھ بھی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں۔

اسی طرح مسند احمد کی روایت میں صراحتاً مذکور ہے کہ خود حضرت جبرئیل علیہ السلام آیتوں کی ترتیب سے واقف فرما دیا کرتے تھے:

عن عثمانؓ بن ابی العاص: قال کنت جالسا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ شخص ببصرہ ثم صوبہ ثم قال اتانی جبرئیل فامرنی ان اضع ھذہ الآیۃ ھذہ الموضع من ھذہ السورۃ (ان اللہ یامرکم) الی آخرھا۔ (۲)

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر تھا، اچانک آپ نے آنکھیں بند کیں، پھر کھولا اور فرمایا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ اس آیت (ان اللہ یامرکم الخ) کو اس سورت کی فلاں جگہ پر رکھوں۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی روایتیں ہیں جو آیات کے توقیفی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، پس آیات کی ترتیب اللہ ہی کی طرف سے مقرر کردہ ہے، اور پوری امت اس پر متفق ہے۔

سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے

آیات کی ترتیب کے علاوہ ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا آیتوں کی ترتیب کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، یا ان کی ترتیب اجتہادی ہے؟

علامہ سیوطیؒ، حافظ ابن حجرؒ اور قرطبیؒ وغیرہ نے جمہور کا مذہب سورتوں کی ترتیب کا اجتہادی ہونا نقل کیا ہے، ابن حجر فرماتے ہیں: ان ترتیب السور ولیس بتوقیف من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو قول جمہور العلماء۔ (۳) قاضی ابوبکر باقلانی بھی سوری ترتیب کے اجتہادی ہونے کے قائل ہیں، اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ تلاوت، تعلیم، درس اور نمازوں میں سورتوں کی ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، (۴) اور علامہ زرکشی کہتے ہیں کہ بعض سورتوں کی ترتیب خدا کی واجب کردہ نہیں بلکہ

---

(۱) بخاری شریف ۲/۶۵۰ (۲) مسند احمد۔

(۳) فتح الباری ۹/۴۰ (۴) حوالۂ سابق۔

صحابہؓ کے اجتہاد پر مبنی ہے۔

اس کے بالمقابل دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ آیتوں کی ترتیب کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے اور اللہ ہی کی جانب سے مقررہ ہے، علامہ کرمانی کا بیان ہے کہ کتاب اللہ کی موجودہ ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق ہے: وترتیب السور ھکذا ھو عند اللہ فی اللوح المحفوظ علی ھذ الترتیب[1]۔

ان اقوال کے علاوہ سلف کے بہترے اقوال موجود ہیں، جو سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ جس طرح روایتیں آیتوں کے توقیفی ہونے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں، سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں بھی روایتیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اگر قرآن کی سوری ترتیب نہ ہوتی تو آپ کس طرح سنایا کرتے تھے، یقیناً کوئی ترتیب رہی ہوگی جس کے مطابق آپؐ نے قرآن سنایا ہوگا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپؐ کاتبین وحی کو آگاہ فرما دیتے کہ فلاں سورت یا آیت کو فلاں سورت یا آیت سے ملا دیا جائے ـــــ آپؐ کا یہ عمل بھی سورتوں کے توقیفی ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس لئے روایات کی روشنی میں بھی یہ بات حق بجانب معلوم ہوتی ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے ـــــ امام مالکؒ باوجودیکہ بعض سورتوں کی ترتیب کو اجتہادی اور بعض کو توقیفی مانتے تھے، پھر بھی وہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے کہ صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا قرآن سنا تھا اسی طرح ترتیب بھی دیا تھا۔ "انما الفوا القرآن علی ما کانو یسمعونہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم"[2] اور علامہ بغوی "شرح السنہ" میں اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان الصحابۃ رضی اللہ عنھم جمعوا	صحابۂ کرام نے باہم اتفاق رائے سے بغیر کسی کمی و زیادتی
بین الدفتین القرآن المنزل من غیر	اور آگے پیچھے کے کسی فرق کے بغیر قرآن کو دو جلدوں کے

---

(۱) الاتقان ۱/۱۷۷۔ (۲) ارشاد الساری ۷/۴۴۹۔

ان یکونوا زادوا ونقصوا منه شیئاً باتفاق منهم من غیر ان یقصوا شیئاً او یؤخروه بل کتبوه فی المصاحف علی الترتیب المکتوب فی اللوح المحفوظ بتوقیف جبرئیل علیه السلام علی ذالك واعلامه عند نزول کل آیة بموضعها واین تکتب[1]

درمیان جمع کیا، بلکہ ان حضرات نے مصاحف میں اسی ترتیب پر قرآن کو مرتب کیا تھا، جو لوح محفوظ میں ہے ـــ اور ہر آیت کے نزول کے وقت خود حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے محل اور موقع کی اطلاع کرتے تھے اور انہی کی ہدایت کے مطابق یہ مصاحف مرتب ہوئے تھے۔

ان تفصیلات سے یہ مسئلہ منقح ہو جاتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہی ہے اجتہادی نہیں ہے اور یہی مذہب مختار ہے۔

سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر شبہہ

ترمذی، ابوداؤد اور احادیث کی دیگر کتابوں میں یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت عثمانؓ سے سوال کیا کہ سورۂ برات "مئین" میں سے ہے اور سورۂ انفال "مثانی" میں سے ہے، نیز سورۂ برات اخیر میں نازل ہوئی تھی اور سورۂ انفال ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی تھی، اتنے فرق کے باوجود بغیر "بسم اللہ" ذکر کئے، دونوں کو ایک ساتھ کیونکر ملا دیا گیا ــــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو کاتبین وحی کو بلا کر نشان دہی فرما دیا کرتے کہ یہ آیت فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھ دی جائے۔ سورۂ انفال ابتداء ہجرت میں اور سورۂ توبہ آپؐ کی اخیر عمر میں نازل ہوئی تھی، ان دونوں سورتوں کے مضامین ملتے جلتے تھے، آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن آپؐ نے یہ نہ بتایا کہ دونوں سورتیں ایک ہی ہیں، یا الگ الگ سورتیں ہیں، اس لئے میں نے دونوں سورتوں کو الگ الگ اور درمیان میں "بسم اللہ" لکھے بغیر ملا دیا،[2] کہ اگر یہ دو سورتیں ہوں تو وہ دونوں الگ رہیں،

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ۱/ ۱۰۵۔

(۲) ترمذی شریف ۲/ ۱۳۹۔

اور ایک ہی ہوں تو "بسم اللہ" کا فصل نہ رہے۔

اس روایت سے شبہہ ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کرام نے اجتہاد کے ذریعہ مقرر کی تھی، گویا سورتوں کی موجودہ ترتیب اجتہادی ہے ـــــ یہی روایت ان حضرات کا مستدل ہے، جو سورتوں کی ترتیب کو اجتہادی مانتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اکثر اہلِ علم سورتوں کی ترتیب کو اجتہادی کہتے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ نے سورتوں کی اجتہادی ترتیب ہونے کا انکار کیا ہے اور روایت مذکورہ سے ہونے والے شبہہ کا جواب اس طرح دیا ہے کہ قرآن آپؐ کی نبوت کا نور شریعت اسلامیہ کی واضح دلیل اور اس کی اساس و بنیاد ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ نازل ہونے والی آیت یا سورت کی ترتیب سے آپؐ نے صراحتاً آگاہ کر دیا ہو گا، یا کم از کم اس کی ترتیب کی طرف اشارہ کر دیا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کے اجماع پر چھوڑ دی ہو کہ وہ اپنے اجماع سے اس کی جگہ متعین کر لیں[1]۔ پس یہ تعین صحابہؓ کے اجماع سے ہوئی، گویا اجماع صحابہ بھی منشائے نبویؐ کے مطابق ہی ہوا، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ترتیب اجتہادی ہے ـــــ خلاصہ یہ کہ آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔

اسلام ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے جو کتاب انسانی ہدایت کے لئے پیش کی وہ ادنیٰ تغیر اور تحریف و تصحیف کے بغیر کلیتاً محفوظ ہے اور انشاء اللہ تا قیامت باقی رہے گی، بخلاف دوسرے آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب کے کہ ان کی کتابیں مرورِ زمانہ کے ساتھ اس درجہ تحریف کا زخم کھا چکی ہیں کہ اب ان کی اصل صورت یکسر مسخ ہو کر رہ گئی ہے ـــــ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ٥۔

---

(۱) والذی ینشرح له صدر ھذا الفقیر ھو ما انشرحت له صدور الجمع الفقیر من ان ما بین اللوحین الآن موافق لما فی اللوح من القرآن وحاشا ان یھمل صلی اللہ علیه وسلم امر القرآن وھو نور نبوته وبرھان شریعته فلا بد اما من التصریح بمواضع الآی والسور واما من الرمز الیھم بذلك واجماع الصحابة فی المآل علی ھذا الترتیب۔ روح المعانی ۱/۲۷۔

فنِ حدیث کی اہمیت اور اس کی تاریخ

خطاب: حضرت مولانا مجاہد الاسلام القاسمی

مورخہ ۶ر ذوقعدہ ۱۴۰۹ھ کو دارالعلوم سبیل السلام میں شعبۂ "تخصص فی الفقہ" کے افتتاح اور بخاری شریف کے آغاز کے سلسلے میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں متعدد اہلِ علم کے علاوہ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی شریعت بہار واڑیسہ نے شرکت کی اور نہایت عالمانہ اور فکر انگیز تقریر فرمائی۔ مولانا سرفراز احمد صاحب قاسمی نے اس کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے نقل کیا۔ ذیل میں اسی تقریر کا متن قارئین کی نذر ہے۔ (ادارہ)

اللہ کی کتاب کے بعد دنیا کی سب سے صحیح ترین کتاب آپ کے سامنے رکھی ہوئی ہے اور اس کا آپ آغاز کر رہے ہیں، درس بخاری کا جو قاعدہ ہمارے یہاں چلا آرہا ہے عام طور پر ایک طویل تمہید اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہے، جس کا تعلق فن حدیث، اس کی تدوین، اس کے اصولوں، اور اس کے اقسام پر علم حدیث میں لکھی گئی کتابوں اور اس میں مختلف کتابوں کے مدارج اور اس میں بخاری کا رتبہ، بخاری کا مخصوص طرزِ عمل، بخاری کا ترجمۃ الباب اور دیگر موضوعات پر تفصیل سے بات کی جاتی ہے، جو علم حدیث کے طلباء کے لئے ضروری ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مجھے اس مسند پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے، خاص کر ایسی مجلس میں جہاں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کئی ماہر اساتذہ علم حدیث بیٹھے ہوئے ہیں اور میرا یہ حق نہیں ہے، لیکن ہمارے عزیز دوستوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے، اس لئے پہلی بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس پس منظر کو آپ سمجھ لیں، جس پس منظر میں حدیث کی یہ کتابیں مرتب کی گئی ہیں تاکہ امام بخاری کے کارنامے کی قیمت آپ محسوس کر سکیں اور اگر یہاں پر وہ طلبہ بھی ہیں جو تخصص فی الفقہ میں داخل ہوئے ہیں اور آگے پڑھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے بھی یہ بات مفید ہوگی، ایک بات یہ بھی ہے کہ ایک طرف طلبہ ہیں، جن کے لئے اور زبان بولنی پڑتی ہے اور دوسری طرف ہمارے دوسرے بھائی ہیں، جن کے لئے دوسری زبان میں بات کرنی پڑتی ہے، میں کوشش کروں گا کہ ایسا توازن برقرار رہے کہ جس سے دونوں کو فائدہ پہونچے۔

حدیث کسے کہتے ہیں

پہلی بات تو اچھی طرح یاد رکھئے کہ حدیث کس کو کہتے ہیں، حدیث کی عام طور پر تعریف یہ کی جاتی ہے کہ قولِ نبی ﷺ عملِ نبی ﷺ اور تقریرِ نبی ﷺ کو حدیث کہتے ہیں ـــــــ یعنی جو بات

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے وہ حدیث اور جو عمل ان کے اعضاء سے صادر ہوئے وہ حدیث اور جس کام آپؐ نے منع نہیں کیا خاموش رہے وہ حدیث۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث کی تعریف ذرا سا فرق کے ساتھ آپ کرلیں ——— یوں کہیں کہ حضورؐ کی طرف جس چیز کی نسبت کی جائے، وہ حدیث ہے، اس لئے کہ موضوعات کو بھی لوگ حدیث کہہ دیتے ہیں، حالانکہ وہ نہ عملِ رسول ہے، نہ قولِ رسول ہے، اس اعتبار سے اس کو حدیث نہیں کہا جانا چاہئے، لیکن بسا اوقات موضوعات کو بھی حدیث کا نام دیدیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے: الاحادیث الموضوعۃ اس لئے آپ صرف اتنا کہیں کہ جس چیز کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جائے، قول ہو، عمل ہو تقریر ہو اور چاہے اس کا تعلق حضورؐ کی صورت، شکل اور نقشے سے ہو کہ حضورؐ کا چہرہ کیسا تھا، آپؐ بولتے کیسے تھے، حضورؐ کی آنکھیں اور بھویں کیسی تھیں، چہرہ کا رنگ کیسا تھا، قدوقامت کیسا تھا، چال کیسی تھی؛ غرض یہ کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت ہے اور جو حضورؐ کے اخلاق ہیں یعنی خلقتِ نبی اور خلقِ نبی، سب حدیث ہے اسی لئے شمائلِ نبی کو بھی آپ حدیث کی کتاب کہتے ہیں، ضروری نہیں کہ حضورؐ نے اپنی تصویر خود بتائی اور اپنے اخلاق خود بتائے ہوں، حضورؐ کے اخلاق کچھ دوسرے لوگوں نے بھی بتائے ہیں؛ نہ وہ حضورؐ کے بول ہیں، نہ وہ حضورؐ کا قول ہے، نہ حضورؐ کی تقریر ہے، لیکن حضور کی طرف ان کی نسبت ہے، اس لئے حدیث میں داخل ہے، تو رسولؐ کی طرف جس چیز کی بھی نسبت کی جائے چاہے وہ قول ہو یا عمل ہو، تقریر ہو، اخلاق ہوں، یا حضورؐ کی خلقی تصویر، یہ سب کی سب چیزیں حدیث میں داخل ہیں، اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہئے کہ چاہے وہ بعثت سے پہلے کے ہوں یا بعثت کے بعد کے ہوں، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی حدیث میں داخل ہوں گے ——— اس کے بعد دوسری بات جو بنیادی ہے وہ یہ سمجھئے کہ حدیث اور سنت گویا مرادف ہیں، حدیث کا جہاں جہاں انطباق ہوتا ہے عام حالات میں سنت کا بھی وہاں وہاں انطباق ہوتا ہے، تیسری بات یہ سمجھئے کہ خاص کر جو فقہ کے طالب علم ہیں ان کو اس بات کو سمجھنا چاہئے، اور حدیث کے طالب علم جو آج نہیں تو کل انشاء اللہ وہ فقہ کے طالب علم بھی بنیں گے، ان کو بھی سمجھنا چاہئے کہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تشریع کا دوسرا ماخذ ہے، یعنی اللہ کی شریعت کو اگر ہم جاننا چاہیں اور اللہ کی شریعت کے احکام کو مستنبط کرنا چاہیں تو سب سے پہلی چیز جہاں سے شریعت نکالی جائے گی اور احکام شرع کا استنباط کیا جائے گا وہ کتاب اللہ ہے اور دوسری چیز سنتِ رسول اللہ ہے۔

یہ دو بنیادی سرچشمے ہیں، دین کو جاننے کے لئے، اللہ کی کتاب اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، یہ بات خاص کر اس لئے بھی سمجھ لینے کی ہے کہ آج کے عہد میں سنت کا انکار کیا جاتا ہے، اسلئے آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کی دو بنیادیں ہیں، دو اساس ہیں، دو سرچشمے ہیں، کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ۔ یعنی جیسے اللہ کی کتاب، قرآن پاک میں لکھی ہوئی بات کو ماننا ضروری ہے اور اگر کوئی قرآن کی بات کا انکار کردے اور کہہ دے کہ قرآن کے حکم کو ہم نہیں مانیں گے، تو وہ مسلمان باقی نہیں رہے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ میں حکم رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانوں گا (العیاذ باللہ) تو وہ مسلمان باقی نہیں رہے گا، اس لئے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ دونوں بنیادیں ہیں، کتاب اللہ کا بنیاد ہونا ظاہر ہے، لیکن سنتِ رسول اللہ کے بنیاد ہونے کے لئے قرآن کا مطالعہ آپ کریں، سورۂ نساء میں فرمایا گیا: یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (آیت ۵۹) "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول اللہ ﷺ کا" ——— پس اگر کوئی شخص کہے کہ میں اللہ کا حکم تو مانوں گا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی بات نہیں مانوں گا، تو وہ اللہ کی بات بھی نہیں مان رہا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ بات مانو اللہ کی اور بات مانو رسول اللہ ﷺ کی۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ "جس نے رسول کی بات مانی اس نے اللہ کی بات مانی"۔ میں الٹ کر کہنا چاہتا ہوں، جس نے رسول کی بات نہیں مانی، اللہ کی بات نہیں مانی۔ ماٰ اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا۔ "جو تم کو رسول دیں اس کو لو اور جس سے رسول منع کریں اس سے رک جاؤ" ——— پس رسول کے ہر حکم کی تعمیل اور رسول کی ہر ممانعت سے رک جانا یہ ضروری ٹھہرا قرآن کی رو سے۔ اس لئے امر رسول اور نہی رسول کو تسلیم کرنا یہ ہر مومن کے لئے فرض ٹھہرا۔ اس لئے مصدر قانون اور سرچشمۂ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسے اللہ کی کتاب ہے ویسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور صاف فرمادیا گیا: فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ——— "کہ تیرے رب کی قسم اے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم! لوگ صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتے، جب تک کہ دنیا کے ہر معاملے آپ کے سامنے نہ پیش کریں، اور آپ جو فیصلے کردیں اس فیصلہ کو دل کی گہرائی کے ساتھ تسلیم نہ کریں، اس کے سامنے سر نہ جھکادیں دل میں اس کے بارے میں ذرا بھی کچھ تذبذب محسوس نہ کریں"۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں

سنتِ رسول اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واجب التعمیل ہونے اور شریعت کے سرچشمہ ہونے کو واضح طور پر بیان فرمادیا ہے، اسلئے اگر کوئی شخص سنتِ رسول ؐ کے حجت ہونے کا انکار کرتا ہے تو دراصل وہ قرآن کا انکار کرتا ہے۔ آگے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: یاایھا الناس انی ترکت فیکم ما ان اعتصیتم بہ میں تمہارے پاس ایسی چیز چھوڑ کر جارہا ہوں کہ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو: "لن تضلوا" تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ پھر فرمایا: کتاب اللہ وسنت نبیہ ——— معلوم ہوا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کے مطابق ایک مومن کے لئے قانون کا حصّہ اپنی زندگی کا محور اور اپنے مختلف حالات میں احکام کے استنباط کا سرچشمہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور وہ خطرہ جو آج پیش آرہا ہے، اس کو بھی ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مختلف کتابوں میں یہ روایت ملے گی کہ:

سنّتِ نبوی: تشریع کا دوسرا اہم ماخذ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار خبردار ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص ایسا ہو جس کے پاس میری حدیث پہونچے اور حدیث پہونچنے کے بعد وہ کہے کہ مجھے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں کفینا کتاب اللہ، میرے لئے تو اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ما وجدتم من حلال فاحلوہ وما وجدتم من حرام فحرموہ۔ کہ جو تم اس میں حلال پاؤ اس کو تم حلال سمجھو اور جو تم حرام پاؤ اس کو حرام قرار دو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خبردار یہ کون لوگ ہیں: متکئی علی اریکتہ اپنی مسہری پر ٹیک لگائے ہوئے لوگ کہیں گے۔ مسہری پر ٹیک لگانے والے کون لوگ ہیں؟ وہ اصحابِ تعیش ہیں اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے والے ہیں، جنہوں نے علم کی حقیقت کی تلاش میں نہ کبھی سفر کیا، نہ صبح نکلے نہ شام نکلے، نہ راتیں انہوں نے خرچ کیں اور نہ دن کی تمازت و دھوپ برداشت کی، نہ بھوک اور فاقہ جھیلا، نہ علماء کی درس گاہوں میں جاکر انہوں نے تکلیفیں اٹھائیں اور نہ علماء اور اصحابِ تحقیق سے کوئی رابطہ رکھا، وہ تو اپنی اپنی عیش گاہوں میں، اپنے اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں اور اپنی اپنی دولت کے اندر مغرور رہے، وہ یہ تبصرہ

کرتا ہے کہ لے جاؤ بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو، مجھے تو کتاب اللہ لاکے دیدو۔ یہ در اصل وہ گمراہ لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کا نام لے کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑنے کی دعوت دے کر اصل میں اللہ کی کتاب ہی کو آپ سے چھوڑوا دینا چاہتے ہیں۔

بعض شبہات کا جواب

اس سلسلے میں بعض لوگ بعض روایتیں بھی نقل کرتے ہیں، مثلاً کسی نے یہ روایت نقل کردی کہ میری حدیث تم کو پہونچے تو اس کو قرآن پر پیش کرنا، اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرنا، ورنہ مت ماننا۔ یہ حدیث جھوٹی، من گھڑت اور موضوع ہے، اس پر تمام علماء نے اتفاق کیا اور تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے کہ یہ حدیث معتبر نہیں ہے۔ حدیث معتبر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے قرآن بھی دیا ہے، ومثلہ معہ اور ہمیں اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی دیا ہے، پس جیسے قرآن کو ماننا ضروری ہے، مثلہ معہ کو بھی ماننا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا، سنو! کہ میری زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں حرام کی ہیں، آپ نے قرآن میں پڑھا کہ خنزیر حرام ہے، شراب حرام ہے، جو حرام ہے، لیکن میں اعلان کرتا ہوں کہ کل ذی ناب من السبع۔ ہر ذی ناب درندہ بھی حرام ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ایسی چیزوں کے واجب ہونے کا ذکر فرمایا۔ فرمایا کہ مسلمانوں کی ضیافت بھی واجب ہے۔ پس کئی ایسی چیزیں ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں ملیں گی، اور کتاب اللہ میں نہیں ملیں گی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی عجیب بات "کتاب الکفایہ" میں خطیب بغدادی نے نقل کی ہے کہ حضرت عمران بن حصین ایک دن بیٹھے ہوئے اپنے شاگردوں کو حدیثیں سنارہے تھے۔ ایک شخص کہنے لگا، چھوڑیے حدیثوں کو ہمیں تو اللہ کی کتاب سنائیے۔ سیدنا عمران بن حصین بہت جوش میں آئے اور فرمایا کہ ٹھیک کہتے ہو اے لوگو! ۔ اے لوگو! پانچ وقت کی نماز فرض ہے، قرآن سے ثابت کرو، ظہر میں چار رکعت اور عصر میں چار رکعتیں اور مغرب میں تین رکعتیں اور عشاء میں چار رکعت اور فجر میں دو رکعت ان کو قرآن سے ثابت کرو اور رکوع اور قومہ ثابت کرو اور پوری جو ہیئت نماز کی ہے، اس کو قرآن سے ثابت کرو۔ قرآن نے کہا: ولیطوفوا بالبیت العتیق ۔ تو قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ خانۂ کعبہ کا طواف کرنا چاہیے۔ لیکن

سات شوط کرنا چاہیئے قرآن سے ثابت کرو اور سعی بین الصفا اور مروہ ثابت کرو، وقوفِ عرفہ کی بحث قرآن سے ثابت کرو اور حج کے تمام مناسک قرآن سے ثابت کرو اور چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا، یہ تو قرآن میں ہے، لیکن کہاں سے کٹے گا؟ قرآن سے ثابت کرو۔ غرض کہ ایک طویل تقریر فرمائی سیدنا عمران بن حصین نے اور فرمایا کہ لوگو سن لو! ہم تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دین کو جانتے ہیں، پس حضورِ اقدس جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ہم نے سیکھا ہے، ہم اس کو دین جانتے ہیں، اسلئے تم اگر دین جاننا چاہتے ہو تو تم کو ہم سے وہ بات لے لینی چاہیئے، جو ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لی ہے۔ اسی طرح عبداللہ ابن عمر سے ایک سوال کیا گیا کہ یہ بات قرآن میں کہاں لکھی ہے؟ عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ بھائی! اس حال میں اسلام ہمارے پاس آیا کہ: ما کنا نعلم شیئاً۔ ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ پس یہ ہم نے جنابِ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو جیسا کرتے ہوئے دیکھا ویسا ہم نے کیا، اور یہی دین ہے، اسے تمہیں بھی لینا ہے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج فرمایا تو حجۃ الوداع کے موقع پر ہر عمل کے بعد صحابہؓ کو پکار پکار کر کہہ دیتے خذوا عنی مناسککم لوگو! تم اپنے حج اور نسک کا طریقہ ہم سے لیتے چلو اور ہم سے سیکھتے چلو، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حدیثِ نبوی اور سنتِ نبوی دین کی دوسری اساس ہے

سنّت بھی کتابُ اللہ کا جزو ہے

اور حقیقت یہ ہے عزیزو! کہ یہ سنت نبویؐ دراصل شرح ہے قرآن کریم کی۔ قرآن کریم جو کچھ کہتا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے گا۔ اس کی تفصیل اگر سمجھنا ہو تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے، کہ تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی طرف رجوع کرو، اس کے بغیر تمہیں قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا، اسلئے حدیث کی حیثیت شارحِ قرآن کی ہے، اسلئے یوں کہو کہ جیسے قرآن بنیاد ہے دین کی، حدیثِ نبوی بھی دین کا جزو ہے، گویا یوں سمجھے کہ قرآنِ پاک کا ایک حصہ۔ اللہ کی کتاب میں۔ اور ایک وحی غیر متلو ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں مرتب کر دی گئی ہے اور ایک بات بڑی اچھی کہی علماء کرام نے کہ:۔ القرآن

احوج الی السنة من السنة الی القران ۔ قرآن اپنا فہم اپنے کو سمجھانے اور اپنی مراد کو واضح کرنے کے لئے جتنا سنت کا محتاج ہے، سنت قرآن کی اس درجہ محتاج نہیں، اگر سنت تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے تو قرآن کی تفسیر نہیں ہوگی، بلکہ قرآن کی تفسیر بالرائے ہو کر گمراہی کا ذریعہ بن سکتی ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ قرآن زیادہ محتاج ہے اس بات کا کہ تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعہ اس کی تفسیر کرو۔

اب اس ارشادِ باری کو ذہن میں رکھئے کہ: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ہ کہ ہم نے ہی اس ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، پس یاد رکھئے کہ جیسے اللہ کی اس کتاب کو نازل فرمایا گیا اور وہ ذکر کا ایک حصہ ہے۔

اسی طرح وہ حصہ جو سنت کے نام پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جاری ہوا وہ بھی اسی ذکر کا حصہ ہے، اس طرح قرآن اور سنتِ نبوی دونوں کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نسلاً بعد نسلٍ اس چودہ سو برس میں لاکھوں لاکھ کی تعداد میں ایسے علماء و فقہاء پیدا ہوئے جنہوں نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی زندگیاں کھپا دیں اور اسی پس منظر میں امام بخاریؒ کی یہ کتاب "الجامع الصحیح" دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کے ساتھ ساتھ وحی غیر متلو، یعنی سنتِ نبویؐ کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے امام بخاری اور دیگر محدثین سے وہ کام لیا عزیزو! جو کام انہوں نے حفظ قرآن کے لئے کیا، اللہ تعالیٰ نے وہی کام حفظ حدیث کے لئے بھی کروایا، تاکہ یہ کبھی ہاتھوں سے نہ نکلے۔ یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لو! اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن پاک اتارا اور اس کے شارح کی حیثیت سے اپنا آخری رسول بھیجا، ساتھ ہی قرآن پاک اور اس کی شرح سنتِ رسول کی حفاظت کا اعلان فرمایا، جو یقیناً اللہ تعالےٰ کا ہم پر ایک عظیم احسان اور بڑا فضل ہے۔

صحابہؓ بھی منتخب اور مصطفیٰ ہیں

اور یہ بھی ایک حقیقت اور سچائی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک جامع کمالات اور ایسے فضائل و خصوصیات کے حامل تھے کہ اس پوری کائنات انسانی میں کوئی ان کی نظیر نہیں، کوئی ان کے

قدموں کی دھول کو نہیں چھو سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو سب سے بڑا فضل فرمایا وہ یہ کہ اپنی اس کتاب اور رسولؐ کی سنت کی حفاظت کے لئے، رسولؐ کی حدیث کے لئے بھی کچھ افراد کو منتخب فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے کیف ما اتفق لوگوں کو اس کا موقع نہیں دیا کہ کوئی اسلام قبول کر کے حضورؐ کے ساتھ رہنے لگے، جو جی میں آئے کرتا رہے، نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جیسے اپنے پیغام کو پہونچانے کیلئے رسول کو منتخب فرمایا رسولؐ کے لائے ہوئے پیغام کی حفاظت کے لئے صحابہؓ کو بھی منتخب فرمایا۔ ایک شان ہوتی ہے اجتبائیت کی، تو ویسے ہی، اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا اور چن کر رکھا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے شرف صحابیت سے نوازا اور اس کا نظم رکھا کہ میرے رسولؐ کے ساتھ کون رہے، کیسے لوگ ان سے دین حاصل کریں اور ساتھ رہکر ان کی ایک ایک بات کی حفاظت کریں اور کون ان کی ایک ایک ادا کی نقل کرے اور پھر صرف حفاظت ہی نہیں بلکہ اگلی نسلوں تک اس کو منتقل کرے۔ سیدنا ابن عبد اللہؓ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: من کان مستنا فلیستن بمن قد مات اولئک اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کو کوئی راہِ عمل اختیار کرنی ہے، تو اس کو ان لوگوں کی پیروی کرنی چاہئے، جو گذر چکے ہیں یعنی اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور فرماتے ہیں کہ اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کون تھے؟ ان اللہ نظر فی قلوب العباد۔ اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھا تو خیر قلوب العباد، تمام انسانیت میں جو بہترین دل تھے ان کو نبوت کے منصب کے لئے منتخب فرمایا اور آگے فرماتے ہیں۔ ثم نظر فی قلوب العباد۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے قلوب میں جھانکا تو نبیوں کے بعد جو بہترین قلوب تھے، ان کو نبیؐ کی صحبت کے لئے پسند فرمالیا، چھانٹ لیا منتخب فرمالیا، ان کو مجتبیٰ منتخب اور ممتاز بنالیا، گویا یہ حضرات چھٹے ہوئے ہیرے اور منتخب جواہرات ہیں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں، انتہائی درجہ ذکی اور انتہائی درجہ کے فقیہ، بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے انتہائی درجہ پرہیزگار، بہت قوی الحافظہ اور بہت زیادہ زبردست قوتِ مشاہدہ رکھنے والے، کوئی چھوٹی سے چھوٹی ادا بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انہوں نے ایسی نہیں چھوڑی جس کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ نہ رکھا گیا ہو۔ فاختارھم لصحبۃ نبیہ کانوا ابر الناس قلوبا۔ دلوں کے اعتبار سے نیک ترین لوگ تھے۔ اعمقھم علما۔ علم کے اعتبار سے بہت گہرے تھے، پرہیزگاری کے اعتبار سے ان کی مثال نہ تھی۔ اقلھم تکلفا۔ ان میں انتہائی درجہ سادگی تھی، ان کے یہاں تکلف کا کوئی

سوال نہیں تھا۔ بناوٹ نہیں تھی، نمائش نہیں تھی۔ غرض یہ کہ جو بہترین انسان ہو سکتے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمالیا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ کے لئے، اور اگر وہ نہ ہوتے تو نہ اللہ کی کتاب ہمارے پاس رہتی اور نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث ہم تک پہونچتی، اس وقت ایک بات یہ بتانا چاہتا ہوں آپ اسے خوب یاد رکھیں، وہ لوگ جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہؓ کا اعتماد مجروح ہو جائے، جن کی کوششوں کا محور یہ ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی عزت اور ان کا مقام گھٹے، صحابہؓ کا اعتماد گرے اور ان کو کمزور و مجروح کیا جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دراصل صحابہؓ کو برا نہیں کہہ رہے ہیں، بلکہ یہ برا کہہ رہے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ کیوں؟ کسی کے ساتھی پر اعتراض دراصل خود اس شخص پر اعتراض ہے۔ کسی صحابہ کو برا کہنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ برے لوگوں کے ہم نشیں تھے۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ دیکھئے صحابہ کو برا کہنے کا حاصل کیا نکلا؟ اسلئے یہ کہنا کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنے برے اور غلط قسم کے لوگ رہا کرتے تھے، دراصل حضورؐ کو برا کہنا ہے، صحابہؓ کو نہیں ہے۔ نعوذ باللہ۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، ان سے خلیفہ مہدی نے یہ سوال کیا کہ آپؓ کی ان لوگوں کے بارے میں جو صحابہؓ میں نقص اور عیب نکالتے رہتے ہیں، کیا رائے ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا: انھم زنادقہ کہ وہ لوگ جو عیب اور نقص نکالیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں وہ زندیق ہیں، مہدی نے کہا حضرت! آپ یہ بالکل نئی بات کہہ رہے ہیں، انہوں نے کہا ہاں، یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے عوامی دباؤ کے باعث اور عام مسلمانوں میں قطعاً ناقابلِ قبول ہونے کے باعث رسول کو برا نہیں کہہ سکتے تو اپنے دل کی بھڑاس رسول کے ساتھیوں کو برا کہہ کر نکالتے ہیں، ان کو اس کی جرأت نہیں کہ وہ رسول کو برا کہیں، تو رسول کے اصحاب کو برا کہتے ہیں، اسلئے زندیق ہیں، کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین کے الفاظ اور دین کے ظاہر کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کی حقیقت کو اندر سے مسخ کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی الفاظ قرآن اور الفاظ حدیث کی ایسی تاویل و توجیہ کرنا چاہتے ہیں، جو دنیا کی حقیقت کے مغائر ہے، لیکن الفاظ کے جامہ کو برقرار رکھتے ہوئے اندر کی حقیقت اس میں سے کھینچ لینا چاہتے ہیں، اور اس طرح شک اور تذبذب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بدترین لوگ ہیں، کافر و مشرک زیادہ مضر نہیں، لیکن زندیق سب سے زیادہ خطرناک ہے، ہر عہد میں زنادقہ اور ملاحدہ کی جماعت پیدا ہوتی رہی ہے۔

کسی نے نماز کا کچھ اور مفہوم کر دیا کسی نے کہا کہ صاحب ٹھیک ہے نماز فرض ہے، لیکن جب ولایت و بزرگی کے فلاں مقام پر پہونچ جائے تو اس پر نماز فرض نہیں رہتی۔ الغرض کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور کہا۔ پس دین کی صورتوں کو باقی رکھتے ہوئے، دین کی حقیقتوں کو مسخ کرنے والے لوگ زندیق ہیں۔ بڑی معنی خیز بات فرمائی حضرت ابوزرعہ رازی نے، ان سے لوگوں نے کہا کہ جو لوگ صحابہؓ کو برا کہتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو حضرت ابوزرعہ نے فرمایا کہ یہ لوگ زندیق ہیں۔ آگے یہ فرمایا کہ ذرا غور کرو، یہ کون لوگ ہیں؟ دیکھو جب کہ: نحن نومن بان القرآن حق و بان الکتاب الحق و بان الرسول حق کا اعلان کرتے ہوئے ہم اللہ کی کتاب اور رسولوں کی باتوں کے حق ہونے کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ کی یہ بات اور رسول کی یہ بات ہم تک حضرات صحابہؓ ہی کے ذریعہ پہونچی ہے، پس جو لوگ صحابہؓ کو برا کہتے ہیں، دراصل وہ ہمارے گواہوں کو مجروح قرار دیتے ہیں: انھم یجرحون شھودنا، اور یہ کتاب و سنت کے بنیادی واسطہ کو ہی ناقابلِ اعتبار قرار دیتے رہے ہیں، منشا یہ ہوتا ہے کہ جب گواہ ناقابلِ اعتبار ہو جائے گا تو قرآن اور حدیثِ رسول جو اساسِ دین ہے، ناقابلِ اعتبار ہو کر پورا دین ناقابلِ اعتبار ہو جائے گا، پس صحابہؓ کی مذمت اور ان کی منقصت صحابہؓ کو برا کہنا اور ان کے اعتماد کو مجروح کر دینا ہے۔

میرے عزیزو! دراصل یہ پورے دین کو مجروح کر دینے کی بنیاد ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور کسی بھی لمحہ، کسی بھی بڑے سے بڑے صاحب تقویٰ اور بڑے سے بڑے جبہ و دستار کی کسی ایسی بات کو تسلیم نہ کرنا جس بات کے ذریعہ تمہارے گواہ مجروح ہو جائیں اور ناقابلِ اعتبار ٹھہر جائیں اور اس طرح پورا دین ہی ناقابلِ اعتبار ٹھہر جائے۔ پس یہ بات سمجھ میں آگئی آپ کے؟ کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کے لئے اپنی کتاب اور سنت کی حفاظت کیلئے کیا اور کیسا انتظام فرمایا، ایک پوری ایسی امت ان لوگوں کی منتخب فرمائی، جو انتہائی نیک دل تھے، انتہائی گہرے علم والے تھے، نہایت ذہین لوگ اور نیک خو، بہت محنت کرنے والے، جنہوں نے اپنا مال، اپنی جان سب کچھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دی تھی، جنہوں نے حضور اکرمؐ کی ایک ایک ادا کی حفاظت فرمائی، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے، کبھی غلط بات نہیں بولے، حضورؐ کی طرف کبھی کوئی غلط بات منسوب نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے اس پورے دین کی حفاظت فرمائی، اور میں ایک بات اور کہتا ہوں، اگر کوئی دوسری گواہی ان کے حق میں نہ ہو جب بھی یہ ایک گواہی انکی صداقت اور راست بازی کے لئے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو دلوں کا حال اور کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، وہ

وہ فرماتا ہے: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ پس ان کا مرضی عنہ ہونا اور ان کا پسندیدہ ہونا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کسی جھوٹے، کسی مفتری کو پسند نہیں کر سکتا اور نہ کسی کذاب کو پسند کر سکتا ہے، یہ بالکل کافی ہے صحابہؓ کی عدالت کے ثبوت کے لئے: السابقون الاولون اور آیت شجر پڑھو توان الذین یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم۔ اللہ ان کی اندرونی حالت کو جانتا ہے، یعنی بالکل جانچے پرکھے لوگ ہیں، ان کا ظاہر بھی اور ان کا باطن بھی، اسی لئے کسی طرح اور کسی اعتراض کی گنجائش ان پر نہیں ہو سکتی۔

بہرحال گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا جو سب سے بڑا احسان ہے، سب سے بڑا افضل ہے، وہ یہ کہ اس نے رسول بھی اعظم ترین ہمیں دیا اور رسولؐ کے دین کی حفاظت کے لئے عظیم ترین امت اور سچے گواہ بھی مہیا فرمائے، جن کی عدالت اور توثیق خود اللہ تعالیٰ نے اپنے طور پر فرمائی، قرآن کی مختلف آیات موجود ہیں، تو خود اللہ تعالیٰ جن کی تعریف فرمائے، کائنات اور خلق اللہ کی جرح کا اس پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں امت کا اجماعی فیصلہ ہے: الصحابۃ کلھم عدول۔ تمام صحابہؓ عادل ہیں۔ چنانچہ اس خیارِ امت نے دین کی حفاظت اور سنتِ رسولؐ کی روایت میں ہمیشہ ایک دوسرے کی عدالت پر اعتماد کرتے ہوئے عموماً بلا سند دریافت کئے نقلِ احادیث کا طریقہ اپنایا۔

گڑبڑ شروع ہوتی ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حادثہ شہادت کے بعد جب اہلِ سیاست نے غلط قسم کی حدیثیں گھڑنی شروع کیں، تو وضع حدیث کا نیا فتنہ شروع ہوتا ہے۔ اور معاذ اللہ کسی صحابیؓ نے کبھی ایسا نہیں کیا، بلکہ جو لوگ سیاسی تھے اور در اصل فتنہ برپا کرنے آئے تھے، چاہے وہ عبد اللہ بن سبا یہودی ہو، یا اس کے بہکائے ہوئے کچھ لوگ ہوں، انہوں نے جہاں حکومت اور مرکزی نظام کو برباد کرنے کی کوشش کی وہیں انہوں نے اسلام کے دینی نظام کو بھی گھن کی طرح کھانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے وضع حدیث کا فتنہ جگایا ــــــــــ لیکن دیکھو! اللہ تعالیٰ جب دین کی حفاظت کرتا ہے تو کس طرح کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ وضع حدیث کا فتنہ شروع ہو کر پچاس، یا سو برس تک چلتا رہا، بلکہ اس کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے کہ سب سے پہلے وہی حضرات صحابہؓ جو اس زمانہ میں موجود تھے، انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہر وہ شخص جو کسی بات کو حدیث کہہ کر

بیان کرے گا، ہم قبول نہیں کریں گے۔ اس عہد سے پہلے کوئی بھی شخص کوئی بات حدیث کہہ کر نقل کرتا تو وہ قبول کرلی جاتی تھی، کیونکہ اس وقت جھوٹ کا رواج نہیں تھا اور لوگ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں: من کذب علیّ متعمداً فلیتبوا مقعدہٗ من النار۔ جو شخص مجھ پر جھوٹ اور افترا پردازی کریگا اس کو اپنے لئے جہنم کا ٹھکانہ کھوج لینا چاہئے ـــــ اس لئے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب نہیں کر سکتا۔ تاہم جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہلِ سیاست اور فتنہ پردازوں نے اپنے ناپاک مقاصد اور غلط عزائم کے تحت حدیثیں وضع کر کے دین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے دین کی حفاظت کا سامان کر دیا اور اس کے دفاع میں عین اسی وقت علماء کھڑے ہو گئے، چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ اس عہد سے پہلے اگر کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے لوگ اسناد نہیں پوچھتے تھے۔ لیکن اب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ ہم تو پہلے سند نہیں پوچھتے تھے، لیکن اب ہم سند کا مطالبہ کریں گے کہ کون سی بات تم سند کے ساتھ کہتے ہو اور کون سی بات تم بغیر سند کے کہہ دیتے ہو۔ پس سند حدیث کا اجرا اور سندِ حدیث کے مطالبہ کا رواج اسی وقت سے شروع ہو گیا، جب وضعِ حدیث کا فتنہ ظاہر ہوا۔

آگے چل کر یہ فتنہ جیسے جیسے بڑھا ویسے ہی حدیث کے دفاع اور اس کی حفاظت کرنے والے علماء نے سند کی تنقیح اور تحقیق کے اس کام کو برابر جاری رکھا جس کی تفصیل بیان کرنے کا اس وقت موقع نہیں لیکن یہ بات صحیح ہے کہ حدیثیں وضع کرنے کا سلسلہ اولاً اہلِ سیاست سے شروع ہوا، کسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑیں، تو کسی نے ان کی مخالفت میں حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی مناقب میں حدیثیں گھڑنی شروع کیں۔ حالانکہ ان دونوں کو ضرورت نہیں ہے کسی گھڑی ہوئی فضیلت کی، خود اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی فضیلت دی ہے، اور صحیح حدیثوں سے ان کی اتنی فضیلتیں ثابت ہیں کہ موضوع حدیثوں سے ثابت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ثانیاً بعض اہلِ زہد کا بھی اس میں دخل بے شعوری طور پر ہو گیا ہے، جو زاہد لوگ تھے بیچارے، وہ اپنی عبادتوں میں مشغول، ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ علم اور تحقیق کی راہ میں نکلیں، صعوبتیں اٹھائیں، جس نے جو کہا، اس کو سچا مان لیا۔ سنا ہو گا آپ نے ملا جیون کے بارے میں کہ ان کے پاس کسی نے جا کر کہا کہ حضرت! دو چار دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ پوچھا کیوں؟ ضرورت کیا ہے؟ تو جون پور کا پل بھاگا جا رہا ہے، اب انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، روپے نکال کر دیئے۔

اب لوگوں نے کہا کہ حضرت! وہ تو بیوقوف بنا گیا، پل بھی کہیں بھاگتا ہے، فرمایا کہ ہاں پل بھاگ سکتا ہے مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تو یہ ان کا زہد تھا، یہ ان کی نیکی تھی، یہ ان کا اصلاح تھا، نتیجہ یہ کہ کسی سے کوئی بات سنی انہوں نے اس کو بیان کر دیا۔ اس طرح سے بھی روایتوں میں گڑبڑ کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ تیسری طرف جس نے سب سے بڑا فتنہ پیدا کیا اور آج بھی پیدا کر رہا ہے، وہ واعظوں کا طبقہ ہے، ان واعظوں نے ایسی بات جس سے لوگ رونا شروع کر دیں، یا ایسی باتیں جس سے لوگ ہنسنا شروع کر دیں اور کچھ محیر العقول واقعات جن کو عام عقل نہیں مانتی، ان کو بیان کر کے لوگوں کے اندر ایک تعجب اور حیرت کی نفسیات پیدا کر کے اپنے وعظ کی تاثیری قوت کو بڑھانا اپنا کمال فن سمجھا۔ پڑھو انما الاعمال بالنیات، یعنی بیانِ حدیث مطلوب نہیں، اور لوگوں میں ذکر و ارتہاب مطلوب نہیں، بلکہ ایسی ایسی باتیں بیان کرنا جس سے لوگ ششدر رہ جائیں، لوگوں کی کیفیت بدل جائے، دنیا کمانے کے لئے بسا اوقات واعظوں نے وعظ میں ایسی روایتیں گڑھ گڑھ کر بیان کرنا شروع کیں جو علم کی کسوٹی پر کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے ساتھ ایک دوسرے محدث ایک مسجد میں گئے، نماز کے بعد وعظ ہوا، ایک واعظ صاحب نے کھڑے ہو کر روایت بیان کرنا شروع کیا: حدثنی احمد بن حنبلؒ اور حدثنی فلاں دونوں صاحبان کا نام لیا کہ انہوں نے ایسا ایسا فرمایا، جب تقریر ختم ہو گئی تو یہ دونوں بزرگ آگے بڑھے اور کہا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی؟ کہا احمد بن حنبل نے اور فلاں نے بیان کی۔ کہا میں ہی تو احمد بن حنبل ہوں اور یہ حضرت ہی تو فلاں ہیں۔ کہا کہ تم بالکل احمق ہو، کیا دنیا میں ایک ہی احمد بن حنبل پیدا ہوا ہے.....

غرض یہ کہ اس طرح کے مختلف طبقات کا وضع حدیث میں دخل رہا۔ لیکن میرے نزدیک سب سے خطرناک طبقہ اہل زہد اور اہل وعظ کا طبقہ ہے، اس لئے کہ ان کی بات کو مسلمانوں کے معاشرے میں سچا مانا جاتا ہے، بے دین لوگوں نے جو حدیثیں گڑھیں، دین میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے ان کو تو لوگ جانتے ہیں کہ یہ بے دین لوگ ہیں، مگر دین داروں کے ذریعہ اگر غلط حدیث کا رواج بڑھتا ہے، تو اس کا ضرر زیادہ ہو سکتا ہے میں خاص طور سے کہتا ہوں کہ تم طلباء ہر لکھی ہوئی چیز کو حدیث نہ سمجھنا اور حدیث کہہ کر نہ بولنا، اس کی عادت ڈالو کہ حدیثوں کی تحقیق کرو، کون سی حدیثیں صحیح ہیں، کون سی ضعیف اور کون سی موضوع ہیں، انکی تحقیق کرو، ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک رجحان آج یہ بھی ہے کہ تحقیق و تنقید کے نام پر بہت سے لوگ ضعیف حدیثوں کو بھی موضوع حدیثوں میں شمار کرنے لگے ہیں، اور دونوں کو ملا کر بیان کرنے لگے ہیں۔

یہ طریقہ بھی غلط ہے، اس لئے کہ ضعیف حدیثیں بعض اوقات دین میں حجت ہیں۔ مثلاً خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر ضعیف حدیث بھی کوئی مل جائے اور قیاس کے متعارض ہو تو حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا اور قیاس کو چھوڑا جائے گا، یہ اصول ہے حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا۔ اسلئے حدیثِ ضعیف کو مطلقاً رد کرنا، یا اسے موضوع کہہ دینا دراصل دین کے ایک بڑے حصّہ کو بے کار کر دینے کے مرادف ہے تو اس بات پر بھی چوکنا رہنا چاہیے۔ بہرحال، تو اس طرح کام ہوتا رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ حدیث کی تدوین کا کام شروع ہوا۔ امام زہری کے بارے میں کہا جاتا ہے: اول من دون الحدیث ابن شہاب الزھری۔ ابن شہاب زہری نے سب سے پہلے تدوینِ حدیث کیا، کتابوں میں ربیع بن صبیح وغیرہ دوسرے محدثین کے نام بھی آتے ہیں۔ پھر امام مالکؒ کی ذات سے بھی تدوین حدیث کا بڑا عظیم کام ہوا اور میں کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر کیا جانا چاہیے کہ اگرچہ ذکر نہیں کیا جاتا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات نے بھی اس عظیم کام میں حصہ لیا اور ان کی "مسند" بھی تیار ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ امام مالکؒ کی "موطا" سے پہلے تیار ہوئی تو یہ سب کتابیں خواہ مسانید امام اعظم ہوں، یا موطا امام مالک اور موطا امام محمدؒ وغیرہ وغیرہ، سب ہی حدیث پاک کا ایک عظیم ذخیرہ اور سنتِ رسولؐ کا قابلِ قدر مجموعہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں سب سے بڑا کام جس شخص کے حصہ میں رکھا تھا وہ ہیں سیدنا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے صحیح ترین حدیثوں کا مجموعہ اکٹھا کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا اور بالکل معجزاتی مقبولیت اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو عطا فرمائی، کہ جیسے چودہ سو ۱۴۰۰ سال سے کتاب اللہ پوری حفاظت کے ساتھ ہمارے سامنے محفوظ ہے، ویسے یہ شخص جس نے دوسری صدی ہجری میں اس کتاب کو مرتب فرمایا، بلکہ دو سو سال مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اس کام کو کیا یہ ایک کارِ تجدید تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا، ان کی یہ اہم ترین کتاب بھی آپ کے سامنے موجود ہے، آگے کتاب کی تفصیلات آپ کے استاذ انشاء اللہ بیان کریں گے، میں صرف ایک نکتہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ نہ سمجھنا کہ جتنی صحیح حدیثیں ہیں سب بخاری میں آگئی ہیں، بخاری میں جو حدیثیں ہیں وہ صحیح ہیں، لیکن ہر صحیح حدیث بخاری میں ہے یہ بات مت سمجھنا، بلکہ مختلف کتابوں میں یہ حدیثیں بکھری ہوئی ہیں، خود بخاری نے کہا کہ ایک لاکھ صحیح حدیثوں میں محنت کر کے میں نے چند ہزار حدیثیں اس میں رکھی ہیں، اس لئے تم اس غلط فہمی میں مت پڑو کہ اور وہ حدیثیں جو کہیں اور لکھی ہوئی ہیں ان کو حدیث نہ مانو، یا اس کو کمزور مانو، ایسی بات

ہرگز نہیں ۔ بہر حال امام بخاریؒ کے اس عظیم الشان کارنامے کا اصل پسِ منظر یہ ہے کہ فتنۂ وضع حدیث نے جس طرح حدیثوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کی کوشش کی تھی اور زنادقہ اور ملحدین اور بعض نیک لوگوں کی نیکی سے جس طرح حدیثوں کے ذخیرہ میں بعض غلط چیزوں کا اضافہ کرنا چاہا تھا اللہ تعالیٰ نے امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کے ذریعہ سنت رسولؐ کو صحیح شکل میں رکھنے کا نظم فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو ہر طرح کے فضل اور نعمتوں سے نوازے ، جنہوں نے ہمارے لئے یہ محنت فرمائی ، اور اللہ کے رسولؐ کی وحی اور سنت کو پوری حفاظت سے ہم تک پہونچایا ۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان سب کو ہر طرح کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے علم سے ہم سب کو استفادہ کا موقع عطا فرمائے ۔

اس تمہید کے بعد میں اصل کتاب پہ آتا ہوں ۔ وہ ساری بحثیں کہ یہاں حمد و صلوٰۃ سے آغاز کیوں نہیں کیا ، اور فلاں کیوں نہیں کیا ، وہ اپنے اساتذہ سے معلوم کریں ، میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کا آغاز "بدء وحی" سے کیا ۔ "بدء وحی" کہو یا "بدء الوحی" کہو ۔ تو یہ صاف بات ہے کہ انسان کے علم کے کئی ذرائع ہیں ، آنکھ سے دیکھتے ہو ، زبان سے چکھتے ہو ، ناک سے سونگھتے ہو ، ہاتھ سے چھوتے ہو ، کان سے سنتے ہو ، یہ کہلاتے ہیں "حواسِ خمسہ ظاہرہ" ۔ اور دوسرے ذرائع ہیں ، جس کو "حواسِ خمسہ باطنہ" کہتے ہیں اور اس کے علاوہ ایک ذریعہ علم عقل بھی ہے ۔ عقل کا اصول کیا ہے ؟ وہ یہ کہ عقل جزئیات سے کلیات کا علم استنباط کرتی ہے ، لیکن یہ جتنے ذرائع علم ہیں انسان کے لئے یہ سب ناقص ہیں ، ناکام ہیں ، فیل ہو جانے والے ہیں ، سو فیصدی قطعی اور یقینی نہیں ، آنکھ سے غلط دیکھ سکتے ہو ، کان غلط سن سکتے ہیں ، بسا اوقات ناک کی بو خراب ہو جاتی ہے جس کو زکام ہو گیا ہو ، زبان کا مزہ بگڑ جاتا ہے جس کو نزلہ والی بیماری ہو گئی ہو ، غرض یہ کہ جتنے ذرائع علم ہیں ، حواس ہوں یا عقل ، ان کے ذریعہ جو حاصل ہونے والا نتیجہ علمی ہے ، وہ یقینی نہیں ہے نتیجہ علمی جو یقینی ہے وہ صرف ایک ہے اور وہ وحی ہے ، اسلئے کہ جہاں سے وہ علم آتا ہے وہ علیم و قدیر ہے ۔ اور جس کے پاس آتا ہے وہ سچا اور پکا ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ آتا ہے وہ بھی امین ہے ۔ تفصیل آپ اساتذہ سے معلوم کر لیں گے ۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالےٰ ، جبرئیل امین اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، یا کوئی اور نبی ، جو نبی ہوں ، پس یہ علم ایک باخبر کا ، معتبر ذریعہ سے ، ایک انتہائی امانت دار اور سچے شخص تک پہونچایا گیا ہے ، اسلئے یہ علم سچا ہے ، قطعی ہے ، یقینی اور حتمی ہے : ذالك الكتاب لا ريب فيه ۔ ہر طرح کے ریب ، شک اور تذبذب کی نفی کر دی گئی ۔ اور دنیا کے جتنے علوم ہیں ، سب میں کہیں نہ کہیں شک کا کانٹا چبھنا ضروری ہے ۔

اللہ کی کتاب اور اللہ کی بھیجی ہوئی وحی میں کہیں پر کوئی شک کا کانٹا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب اس کتاب کا تم آغاز کرنے جارہے ہو، تو پہلی بات یہ سمجھ لو کہ "حواسِ خمسہ ظاہرہ" یا "حواسِ خمسہ باطنہ" کے ذریعہ حاصل ہونے والے علوم، بلکہ عقل انسانی کے ذریعہ حاصل ہونے والے علوم بھی ٹھوکر کھلانے والے علوم ہیں، پس یہ کتاب ان علوم پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کتاب کا مقصد وحی الٰہی ہے، جس میں اللہ علیم وخبیر نے جبرئیل امین کے ذریعہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی وحی کے ذریعہ وہ تمام چیزیں نازل فرمائیں، جو انسانی ہدایت کیلئے ضروری ہیں اور اس وحی کی بھی کئی قسمیں ہیں، وحی تو قرآن کی رو سے شہد کی مکھی کو بھی ہوئی ہے، ام موسیٰ کو بھی ہوئی ہے اور ایک وحی وہ تھی جو وحی تکوینی تھی، یہاں مراد وحی تشریعی ہے، اسلئے: انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ فرمایا گیا۔ چونکہ وحی تشریعی کا آغاز سیدنا نوح علیہ السلام سے ہوا ہے، ان سے پہلے تو وحییں اتریں، لیکن وہ وحی تکوینی تھی، کھانا کیسے کھاؤ گے، ہل کیسے چلاؤ گے، اور مردوں کو کیسے دفن کروگے، وغیرہ وغیرہ، یہ تمام کی تمام بحیثیت وحی تکوینی ہیں۔ پس وحی تشریعی کا آغاز سیدنا نوح علیہ السلام سے ہوا، اسی لئے "الی نوح" کی تخصیص یہاں پر کی گئی ہے، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو وحی آئی، اس وحی کو تشبیہ دی گئی ہے اس وحی کے ساتھ جو سیدنا نوحؑ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ خیر جناب یہ حدیث آپکے سامنے ہے، اس حدیث میں: انما الاعمال بالنیات کا مطلب کیا ہے، یہ قصر ہے حصر ہے۔ انما الاعمال بالنیات کا مفہوم یہ ہوگا۔ ما الاعمال الا بالنیۃ۔ اب ما الاعمال سے کیا مراد ہے، یہاں تو بظاہر عمل کی نفی کی گئی ہے۔ ای ما وجود الاعمال الا بالنیۃ۔ اعمال کا وجود ہی نہیں ہوسکتا بغیر نیت کے، تو یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، اسلئے کہ ہم عمل تو ہر روز کرتے رہتے ہیں، نیت کریں نہ کریں، نیت اچھی کریں، بری کریں، اعمال کا وجود تو ہو ہی جاتا ہے، تو ما الاعمال الا بالنیۃ کا کیا مطلب؟ تو کچھ لوگوں نے کہا ما صحۃ الاعمال الا بالنیات اعمال کی صحت مبنی ہے نیت پر، اسلئے وضو صحیح نہ ہوگا جب تک نیت نہ کی جائے۔ فقہائے احناف نے کہا کہ نہیں نہیں۔ ما ثواب الاعمال الا بالنیۃ عمل کا ثواب نہیں ہوسکتا جب تک نیت نہ کی جائے، تو وضو میں جو بغیر نیت کیا جائے ثواب نہیں ملے گا، اور نماز جو بلا نیت پڑھی جائے اس پر بھی ثواب نہیں۔ اب چونکہ نماز سے مقصود بالذات اس کا ثواب ہے اور جب ثواب سے خالی ہوئی تو نماز صحیح بھی نہیں ہوئی، وہاں صحت اس پر موقوف ہوگئی، لیکن وضو کے اندر یہ بات نہیں کہی جاسکتی، اسلئے کہ وضو میں دو مطلوب ہیں، ایک یہ کہ وہ کلید نماز ہے۔ دوسرے یہ کہ

وہ موجب ثواب اور موجب قربت ہے۔ نیت کے فقدان سے قربت اور ثواب ختم ہو جائے گا، لیکن مفتاح الصلوٰۃ ہونے کی حیثیت باقی رہے گی۔ یہ ساری بحثیں آپ نے شرح وقایہ وغیرہ مختلف کتابوں میں پڑھی ہوں گی ہمارے استاذ شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر اتنی بات فرمایا کرتے تھے کہ عموماً لوگ فقہ کی زبان میں اس حدیث کو لے گئے ہیں، ٹھیک ہے، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اصل میں یہ حدیث فقہ ظاہری سے زیادہ فقہ معنوی اور باطنی کی حدیث ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ اعمال کے مدارج کا ارتقار نیتوں کے ارتقار سے ہوتا ہے، اعمال کا وزن اللہ تعالیٰ کے یہاں نیتوں کے وزن کے مطابق ہوگا یعنی اعمال کی قدر و قیمت کا تعین جو اللہ کے یہاں ہوگا وہ نیت کے اعتبار سے ہوگا۔ چنانچہ حضرت داؤد طائیؒ کا قول نقل کرتے تھے: انما ارتقاء عملك عند عالم سريرتك بارتقاء نيتك، کہ جو تمہارے دلوں کا بھید جاننے والا مالک ہے، اس کے سامنے تمہارے عمل کا رتبہ بڑھتا جاتا ہے، تمہاری نیت کے بڑھتے جانے کی وجہ سے، مثال دیتے تھے کہ مثلاً ایک شخص اس لئے نماز پڑھتا ہے کہ اگر نماز پڑھیں گے تو دس آدمی ہمیں بزرگ سمجھیں گے، بڑا نیک سمجھیں گے، پرہیزگار جانیں گے، تو نیت اس کی اللہ کو راضی کرنا نہیں، خلق اللہ کو راضی کرنا ہے، یہ نیتِ خبیث اس کے عمل کو شرک بنادے گی، اور ایک شخص جب نماز پڑھتا ہے، اگرچہ اس نے نماز پڑھی ہو کعبہ میں جاکر، اگرچہ اس نے نماز پڑھی ہو زم زم سے وضو کر کے، لیکن نیت خراب ہے۔ اسلئے نماز اس کی خراب ہو جائے گی۔ اور ایک شخص نماز پڑھتا ہے اسلئے کہ نہیں پڑھیں گے تو جہنم میں جائیں گے پڑھ لیں گے تو جنت ملے گی، تو فرماتے ہیں کہ اس نیت کی وجہ سے اس کو نماز نجات دلادے گی جہنم سے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور جنت میں اس کو داخل کرادے گی۔ مومن کا یہی حال ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جنکی نیت اور ترقی کرتی ہے، ان کے قلب کی کیفیت جب ترقی کرتی ہے اور حالت بدلتی ہے تو وہ اسلئے نماز پڑھتے ہیں کہ ہمیں اللہ مل جائے گا، جنت مل جائے گی نہیں، بلکہ اللہ مل جائے گا۔ تو اللہ کے ملنے کے شوق میں نماز پڑھتے ہیں، العبد يناجي ربه، اللہ سے ملنے کے شوق میں نماز پڑھتے ہیں، ان کا رتبہ بہت اونچا ہوگا، کہ ان کو جنت جہنم کا غم نہیں، بلکہ ان کو دیدار الٰہی کا شوق ہے، کچھ اور لوگ اس سے بھی بلند و بالا ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وصال کیا، ہم کو تو رضاء ربانی چاہئے، جس سے رب ہمارا راضی ہو جائے، وہ ہمیں مل جائے، اللہ چاہے ہمیں ملا کر راضی رہے، جدا کر کے راضی رہے، وہ اگر ہمیں جہنم میں ڈال کر راضی رہے تو ہم انکی رضا پر راضی، جنت میں ڈال کر راضی ہے تو ہم اس پر بھی راضی، ہم اس لائق ہیں کہ ہم کو اس کی بندگی کرنی چاہئے۔

یہ مقام عبدیت کی معرفت ہے، کہ جب مقام عبدیت کسی عبد پر کھل جاتا ہے، تو کسی طرح کی کوئی بات اس کے ذہن میں نہیں کھٹکتی، وہ جانتا ہے کہ میں غلام ہوں، جھکنے کے لئے ہوں، وہ مالک ہیں، وہ ہیں ایسے کہ ان کے سامنے جھکا جائے، ہم کچھ اور نہیں جانتے، ہم محض اسلئے جھکتے ہیں کہ: فارتقاء عملک عند عالم سر یرتک بارتقاء نیتک۔ تو آپ چاہیں تو اسے فقہ میں رکھ لیجئے تو وہ بحث کر لیجئے اور تصوف میں لائیے تو یہ بحث کر لیجئے۔ آگے فرمایا گیا: انما لامری مانوی، آدمی جو نیت کر کے چلتا ہے، وہی اس کو ملتا ہے، آپ کیا بننے کو آئے ہیں، روپیہ کمانے کے لئے آئے ہو، یا امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام محمدؒ وغیرہ بننے کے لئے آئے ہو تو اللہ اس راستے پر آپ کو چلائے گا، بڑی بنیادی بات ہے، اگر اللہ کے علم کو تجارت کا سامان بنا کر روپے کمانے کو نکلے ہو تو ابھی چلے جاؤ واپس، تمہاری ضرورت یہاں نہیں ہے، تم نے اپنے گھروں کو چھوڑا ہے، یہ ہجرت ہے عزیزو! یہ ہجرت کیوں کیا ہے؟ الی دنیا یصیبھا۔ کیوں آئے ہو دنیا کمانے کے لئے، آئے ہو تو فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہمارے اس علم کو محض رضائے خداوندی کے لئے حاصل کیا جانا چاہیے، جو شخص دنیا کے کسی سامان کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لم یجد عرف الجنۃ وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا۔ بہرحال آج ہی فیصلہ کر لینا ہے آپ کو کہ آپ کیا بننا چاہتے ہیں، محمد قاسم نانوتویؒ بننا چاہتے ہو حسین احمد مدنیؒ، محمود حسنؒ، انور شاہ کشمیریؒ اور شبیر احمد عثمانیؒ بہت سے باکمال لوگ گزرے ہیں۔

ان میں سے کسی بھی شخصیت کا ایک نمونہ سامنے رکھ کر اگر ان جیسا بننا چاہتے ہو تو تمہارے لئے گنجائش ہے، فرماتے ہیں: فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لئے ہے، یا کسی عورت سے نکاح کے لئے ہے، تو جدھر اس نے ہجرت کی ہے، ادھر ہی اس کی ہجرت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اخلاص کے ساتھ اور صحیح نیت کے ساتھ دین کا علم حاصل کرنے اور دین کی تبلیغ کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اللہ تر و تازہ اور شاداب رکھتا ہے ان لوگوں کو جن تک میری بات پہونچے، وہ اس بات کو یاد کر لیں، اس کی حفاظت کریں، اور اس کو دوسروں تک پہونچا دیں: فرب مبلغ اوعیٰ من سامع۔ تو جیسا کہ مولانا نے بڑی پیاری حدیث پڑھ کر سنایا کہ اگر پانی اپنے اندر نہیں سمیٹ سکتے ہو تو کم از کم اس کی حفاظت تو تالاب بن کر کر لو کہ دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مطلب یہ کہ یا تو تم خود فقیہ بن جاؤ کہ اس علم کو اپنے اندر سمو کر اس علم سے استنباط احکام کرو، یا کم از کم اس علم کو اپنے اندر محفوظ

کر کے دوسروں تک پہونچاؤ، اسلئے کہ فرب مبلغ اوعیٰ من سامع۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پتھریلی زمین کے نشیبی حصہ میں جما پانی اس زمین میں تو کچھ نہیں اگا سکتا اور کچھ نہیں دے سکتا ہے، لیکن اسی پانی کو جب ہم کسی ذریعہ کسی زرخیز زمین تک پہونچادیں تو ابل آتی ہے اللہ کی قدرت اور چاروں طرف سرسبزی وشادابی اور ہر طرح کی نعمتیں ابل آتی ہیں۔ فرب مبلغ اوعیٰ من سامع۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے بعد میں آنے والے لوگ جنہیں براہ راست یہ علم نہیں ملا ہے، وہ تمہارے مقابلے میں زیادہ اس علم سے فائدہ اٹھائیں، پس دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس صفت وصلاحیت کا بنادے کہ ہم خود ان دینی علوم سے استنباط احکام کر کے پورا پورا استفادہ کرسکیں، یا کم از کم ہمیں محفوظ تالاب تو بنادے علم دین کا کہ جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچایا کریں، اور پناہ مانگیں ہم سب اس بات سے کہ اس چٹیل میدان کی طرح ہوں کہ جس پر علم کا پانی آئے اور بہہ جائے، نہ خود فائدہ اٹھائیں نہ دوسرے ہی فائدہ اٹھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ یہاں فقہ وافتاء کے تخصص کا کام شروع ہوا ہے، دارالافتاء کا نظام جو دراصل لوگوں کو فتویٰ بتانے کے لئے ہے، میں ذرا اس اصطلاح اور نظام سے الگ ہو کر چاہتا تھا کہ فقہ میں تخصص کا نظام مختلف جگہوں پر ہو، اور طریقۂ کار کے طور پر میری خواہش تھی کہ پورے ملک کے پیمانے پر ہم باضابطہ ایک ٹسٹ لے کر، مقابلے کا ایک امتحان لے کر ۲۵/۵۰ لڑکوں کو منتخب کریں، جو ذہین ترین اور باصلاحیت ہوں، اگر ہمارے پاس پانچ سو درخواستیں آئیں اور ہم ان میں سے پندرہ ۱۵، بیس ۲۰ یا پچیس ۲۵ طلبہ کو منتخب کرسکیں تو کریں، اور آج کے دور میں چونکہ یہ مشکل ہے کہ ہم سب باصلاحیت استادوں کو ایک جگہ اکٹھا کرلیں، اسلئے ان منتخب طلبہ کو ممتاز اداروں میں تقسیم کردیں، کچھ طلبہ کو ہم دارالعلوم سبیل السلام بھیجیں، تو کچھ کو دارالعلوم حیدرآباد، کچھ کو ندوہ تو کچھ کو دیوبند، جامعہ رحمانی بھیجیں اور جہاں جس فن کے ماہر ہوں ان کے پاس رہ کر وہ تربیت حاصل کریں، پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن لڑکوں کو ہم دو سال کے لئے روک رہے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ دو سال تک وہ ایک ہی جگہ رہیں، بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کہیں نقد حدیث کا کوئی ماہر ہے وہاں بھی چند مہینے گذاریں، کہیں پر اصول فقہ کا ماہر ہے، چند مہینے وہاں گذاریں، اور جیسا کہ مولانا نے فرمایا کہ یہ اس وقت ہوسکتا ہے، جب کہ مدارس میں ربط وآہنگی ہو اور وہ ایک مقصد کے لئے جڑ کر اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو یہ بات بھی اہم ہے اور یقیناً ایسی کوشش ہونی چاہئے، کیونکہ ظاہر ہے یہ ہماری

الگ الگ دکانیں نہیں، بلکہ ہم سب دین کا کام کرتے ہیں، تو اگر آج کہیں لمیٹڈ انڈسٹریز کی بنیاد پر کوئی پرزہ کہیں اور کوئی پرزہ کہیں بن کر ایک جگہ ضم ہو سکتا ہے اور اس سے پوری مشین وجود میں آسکتی ہے، تو ہم کیوں نہیں ملک میں بکھرے ہوئے باصلاحیت اور قابل اساتذہ کے مختلف علمی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے طلبہ کو ہر فن میں ماہر اور متخصص بنا کر انہیں ایک کام کا بہتر آدمی بنا سکیں۔ پورے ملک کا مسئلہ تو ابھی دور ہے، لیکن کم از کم دو دارالعلوم ہمارے یہاں پر ہیں، جو ہمارے لئے باعثِ فخر ہیں، یہ دونوں جگہ کے اساتذہ ایک ہی درس گاہ کے طالب علم ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی استاذ کے پاس بیٹھ کر پڑھے لکھے لوگ ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حیدرآباد کی بڑی سعادت اور خوش قسمتی ہے۔ میں ذاتی علم کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اتنے قابل، جید الاستعداد علماء اور اساتذہ کا ایک جگہ، یا ایک شہر میں جمع ہو جانا ایک عجوبہ کی سی بات ہے، آپ تلاش کریں تو ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ملے جہاں اتنے ماہر علماء مختلف فنوں کے بیک وقت اکھٹے مل جائیں، یہ سعادت ہے اس شہر کی، یہ خوش قسمتی ہے اس شہر کی۔ دل یہ چاہتا ہے کہ جب دونوں جگہ تخصص فقہ و افتاء کا افتتاح ہو رہا ہے تو دونوں جگہ کے اساتذہ و ذمہ دار اکھٹا ہوں اور بیٹھ کر نقشۂ کار اور یکساں نصابِ تعلیم بنائیں، اور دونوں جگہ کے اساتذہ کو مختلف موضوعات پر لیکچر دینے اور لیکچر تیار کرنے کی ذمہ داری دی جائے اور بیک وقت دونوں جگہ کے اساتذہ سے دونوں جگہ کے طلبہ استفادہ کریں۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہو جائے گا۔

میں سوچ تو سکتا ہوں اور آرزو کر سکتا ہوں، پورا کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، دل یہی چاہتا ہے جو میں نے آپ سے کہا، کاش ایسا ہو جائے، فرض کیجئے کہ عرف پر بحث کرنی ہے کہ عرف کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ عرف کس حد تک معتبر ہے، سد ذرائع پر ہمیں بحث کرنی ہے ـــــــ اور حدیث کی حیثیت پر بحث کرنی ہے ضعاف اور موضوعات کے بارے میں کوئی بحث ہمیں کرنی ہے، تو ان مختلف موضوعات کو مختلف اساتذہ کے درمیان تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ میری یہ بھی خواہش ہے اپنے عزیز مولانا رضوان القاسمی صاحب سے کہوں گا، اور دارالعلوم حیدرآباد کے ذمہ داروں سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ صاحب! ایسی کوشش کریں کہ سال میں دو اولاً تو ہماری خواہش یہ ہے کہ دو سال کا یہ کورس ہونا چاہئے، ملک کے اندر جو باصلاحیت علماء مختلف فن کے ماہرین میں ان کو دعوت دیں کہ وہ توسیعی لیکچر دیں۔ اس موقع سے اگر ہماری قوم اور عوام اجازت دیں تو ایک بات ان سے بھی عرض کروں کہ آپ کا بھی تو عجیب حال ہے، کوئی عام جلسہ ہو

تو آپ چندہ بھی دیجئے گا، خرچ بھی کیجئے گا اور اگر آپ کے اصل، بنیادی کام کو مکمل کرنے کے لئے ریڑھ کی ہڈی تیار کی جائے، لیکن اس میں کوئی نمائش اور اشتہار نہیں تو پھر آپ کا کوئی تعاون ملنے والا نہیں، حالانکہ وہ بنیادی کام ہوتا ہے، وہ اصل اور ٹھوس کام ہوا کرتا ہے۔

بہرحال اگر ایسا ممکن ہو کہ ایسے صاحب فن علماء جو ملک میں بکھرے ہوئے ہیں، یا ملک کے باہر کے ہوں کوئی حرج نہیں ان کو بلا کر ایک ہفتہ کے لئے ان کو توسیعی لیکچر دینے کے لئے کہا جائے، وہ مختلف موضوعات پر ہمارے لڑکوں کو تیار کریں، تو یہ بہت بڑا کام ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا کے سامنے ایک چیلنج ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ رسالتِ محمدیؐ ابدی اور دائمی ہے، اور جب رسالتِ محمدی ابدی تو قانونِ محمدی کو بھی ابدی ہونا چاہئے۔ آج کے دور نے جو سوالات کھڑے کئے ہیں، اگر فقہائے اسلام اس کا جواب نہیں دیتے تو مخالفین کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ابدی نہیں ہے، العیاذ باللہ اگر اسلام ابدی ہے تو وقت نے جو مسائل کھڑے کئے ہیں ان کا جواب دینا ہوگا، چاہے پرانے مسائل نئی شکل میں سامنے آئے ہوں، اس کے لئے بحمد اللہ پرانی محنت بھی موجود ہے، یا نئے مسائل ہوں، اصول و قواعد اور کلیات موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے، میں مبارکباد دیتا ہوں اس مدرسہ کے صدر صاحب کو بھی، ناظم صاحب کو بھی اور دیگر اساتذہ اور کارکنان اور ذمہ داروں کو بھی، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ ایک بڑے کام کی بنیاد ڈلوائی، اللہ تعالیٰ سے میری پرخلوص دعا ہے کہ اس کام کو بہتر طریقہ پر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کام کو قبول فرمائے، اس وقت ہندوستان میں اس کا رواج نہیں ہے، آپ نے ایک نیا کام جو بہت مفید ہے اس کا آغاز کیا ہے، کیا عجب کہ اس کی برکت سے ہندوستان کے ہر کونے میں اس کام کا آغاز ہو جائے، اللہ تعالیٰ جہاں کہیں بھی یہ کام ہوگا اس کا اجر آپ کو دلوائے گا۔ میں اہلِ حیدرآباد کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اتنے بڑے بڑے ادارے ماشاء اللہ قائم کر رکھے ہیں اور اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ اس پر خرچ کرتے ہیں، یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے گا اور ہندوستان کی اس سرزمین پر دین کی حفاظت کے لئے اٹھنے والے قافلہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں کا تیار کیا ہوا دستہ آگے آگے ہوگا، انشاء اللہ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

آلائش نکالنے سے پہلے ذبیحہ مرغ کو گرم پانی میں ڈالنے کا حکم

مرغ حلال جانوروں میں سے ہے اور خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مرغ کا گوشت تناول فرمانا ثابت ہے، موجودہ زمانہ میں، جو مشینی زمانہ ہے، اور جس میں سیکڑوں ایسے آلات و ذرائع پیدا ہو گئے ہیں کہ اس کے ذریعہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام لیا جا سکے، مرغ کے گوشت کے جلد پکانے اور تیار کرنے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کی جاتی ہے کہ مرغ کو ذبح کرنے کے بعد اسے چند لمحہ کے لئے کھولتے ہوئے گرم پانی میں ڈالا جاتا ہے، تاکہ اس کے پر اور بال آسانی سے صاف کئے جا سکیں، اگر ذبیحہ کا معدہ چیر کر اور آنت کی آلائش نکال کر اسے پانی میں ڈالا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ اس میں اہل علم اور فقہاء کا کوئی اختلاف ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر پیٹ چاک کر کے جسم کی آلائش نکالے بغیر مرغی کو پانی میں ڈالا جائے تو آیا پورا مرغ ناپاک ہو جائے گا یا پاک رہے گا اور اگر ناپاک ہوگا تو اس کی تطہیر اور پاکی کی کیا صورت ہوگی؟

یہ مسئلہ اس لئے اہم ہو گیا ہے کہ ایک طرف اس وقت بڑے شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں مرغ ذبح کئے جاتے ہیں اور اسی طرح ان کے بال و پر صاف کئے جاتے ہیں اور گوشت فروخت کئے جاتے ہیں، یہی گوشت گھروں میں پکانے کے لئے سپلائی کیا جاتا ہے، یہی گوشت شادی بیاہ کی تقریبات اور دعوتوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہی گوشت ہوٹلوں میں پکی ہوئی صورت میں دستیاب ہوتا ہے، اس طرح اس نے ایک ابتلاء کی صورت اختیار کر لی ہے، جس سے اجتناب غیر ممکن نہ سہی لیکن دشوار ضرور ہے۔ دوسری طرف بعض اکابر اہل علم نے اس صورت کو ممنوع قرار دیا ہے اور بعض معاصر اہلِ علم بھی اس کے ناجائز ہونے اور ناقابلِ تطہیر ہونے کے قائل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر پورے عمق کے ساتھ غور کیا جائے اور شریعت کی روح اور اس کے مزاج و مصلحت کو سامنے رکھ کر بحث کی جائے۔

فقہاء کے یہاں اصول یہ ہے کہ بنیادی طور پر نجاست کو پاک کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ ازالہ کا ہے اور دوسرا طریقہ استحالہ کا ہے، ازالہ سے مراد نجاست کو ہٹا دینا اور ختم کردینا ہے، اور استحالہ سے مراد اس میں ایسا تغیر ہے کہ اس کی ماہیت اور حقیقت ہی بدل جائے، جیسے گوبر جلاکر راکھ بنادی جائے، یا مردار نمک کی صورت اختیار کرلے۔ پھر ازالۂ نجاست کی دو صورتیں ہیں، اگر نجاست دیدنی ہو اور دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہو کہ وہ موجود ہے، یا ختم ہوگئی، جس کو فقہ کی زبان میں "نجاست مرئیہ" کہتے ہیں، تب تو محسوس طور پر اس کا ختم ہوجانا ضروری ہے، جیسے پائخانہ اور خون وغیرہ۔ اگر یہ نجاست دور ہوجائے، لیکن اس کا رنگ دور نہ ہو پائے تو کوئی قباحت نہیں، اور اگر ایسی نجاست ہو کہ دیکھ کر اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کا اندازہ نہ ہوسکے، تو ایسا عمل ضروری ہوگا جس سے نجاست کے زائل ہونے کا غالب گمان ہوجائے۔ اس کے بعد وہ شیٔ پاک ہوگی، مثلاً اگر دھوکر نچوڑا جاسکتا ہو، تو تین دفعہ دھوکر نچوڑنا پاکی کے لئے کافی ہوجائے گا اور اگر نچوڑا نہ جاسکتا ہو تو تین دفعہ دھوکر خشک کرنا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کفایت کرجائے گا، اور امام محمدؒ کے نزدیک وہ کبھی پاک نہیں ہوسکے گا۔

اوما فیما لاینعصر کالحنطۃ إذا تنجست بمائع والجر دوالحدید والسکین والمرآۃ مما ینجس والحصیر إذا تنجس فعند ابی یوسف یغسل ثلاثا و یجفف فی کل مرۃ فیطھر و قال محمد لایطھر ابدًا لأن النجاسۃ لاتزول إلا بالعصیر ولأبی یوسف أن التجفیف یقوم مقام العصر فی الاستخراج اذ لاطریق سواہ۔

بہرحال ان اشیاء میں جنہیں نچوڑا نہ جاسکتا ہو، جب کہ وہ بہنے والی چیز سے مل کر ناپاک ہوئی ہوں۔ اور ڈھال، لوہا، چھری اور چٹائی ناپاک ہوجائیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اسے تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر بار خشک کیا جائے گا تو پاک ہوجائے گا، اور امام محمد فرماتے ہیں کہ کبھی بھی پاک نہ ہوگا، کیونکہ نچوڑے بغیر نجاست زائل ہوتی ہی نہیں ہے —— امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ خشک کردینا ہی نچوڑنے کے قائم مقام ہوجائے گا اس لئے نچوڑنا ضروری نہیں، کیونکہ اس کے علاوہ پاکی کی کوئی شکل نہیں ہے۔

(بنایہ شرح ہدایہ، ج ۱، ص ۷۶۳، باب الانجاس) ——————

اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر گیہوں کو شراب میں پکا دیا جائے تو امام محمدؒ کے نزدیک وہ کبھی پاک نہیں ہوسکے گا، کیونکہ اس کا نچوڑا جانا ممکن نہیں، یہی رائے علامہ عینیؒ نے امام صاحبؒ سے

نقل کی ہے، جب کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تین دفعہ دھونے کے بعد پاک ہو جائے گا۔[1]

ابن ہمام یہ بھی لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اس مسئلہ میں امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہیں کہ گیہوں اگر نجاست سے پھول جائے تو تین دفعہ دھویا اور خشک کیا جائے، اس کے بعد وہ پاک ہو جائے گا۔[2] ابن ہمام یہ بھی لکھتے ہیں کہ گوشت اگر ناپاک شوربے میں گر جائے، جب کہ شوربا ابال اور جوش کی حالت میں ہو تو تین دفعہ پاک پانی میں جوش دینے کی وجہ سے گوشت پاک ہو جائیگا۔ البتہ تمریض کے صیغہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ پاک نہیں ہوگا: "واللحم وقع فی مرقۃ نجاسۃ حال الغلیان یغلی ثلاثا فیطھر وقیل لا یطھر"[3]۔

آگے علامہ ابن ہمام نے ایک دوسرا جزئیہ نقل کیا ہے کہ اگر کسی دانہ میں شراب سرایت کر گئی ہو اور اسے تین بار دھویا جائے اور اس میں شراب کی بو باقی نہ رہے، تب وہ پاک ہو سکے گا ورنہ نہیں، اس لئے کہ بو کا ختم ہو جانا اثر نجاست کے ختم ہو جانے کی دلیل ہے، پھر ایک اور مسئلہ خلاصہ سے نقل کیا ہے کہ مٹی کے برتن میں اگر شراب ہو، گو وہ برتن نیا ہو اور اسے تین بار دھویا جائے تو امام ابو یوسفؒ کے یہاں پاک ہو جائے گا اور امام محمدؒ کے یہاں کبھی پاک نہ ہو سکے گا، پھر آگے لکھتے ہیں کہ گو اس مسئلہ میں بو کے باقی رہنے نہ رہنے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جب تک بو کا ازالہ نہ ہو جائے، اس کو پاک نہ سمجھا جائے[4]۔ گویا ابن ہمامؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ، قاضی ابو یوسفؒ کے ساتھ ہیں اور صرف تین دفعہ دھونے کو پاکی کے لئے کافی نہیں سمجھتے، جب تک کہ بو کا ازالہ نہ ہو جائے۔

زیلعیؒ نے طحاویؒ سے نقل کیا ہے کہ شراب اگر گیہوں میں گر جائے، اسے دھویا جائے، پھر اس کا آٹا پیس کر روٹی بنائی جائے اور اس میں شراب کی بو اور مزہ محسوس نہ ہو، گو اس کا کھانا جائز ہوگا، مگر یہ اس وقت ہے جب کہ گیہوں اتنی شراب نہ جذب کر چکا ہو کہ اس کی

---

(۱) بنایہ، ج ۱، ص ۳۶۴ (۲) فتح القدیر، ج ۱، ص ۱۸۵۔

(۳) فتح القدیر، ج ۱، ص ۱۸۶۔

(۴) فتح القدیر، ج ۱، ص ۱۸۵۔

وجہ سے گیہوں پھول جائے، اگر وہ پھول گیا، تو اب کبھی پاک نہیں ہو سکے گا۔[1] اس طرح گویا امام محمدؒ کے نزدیک بھی اصل مدار نجاست کے جذب کرنے اور نہ کرنے پر ہے، اگر نجاست اچھی طرح جذب نہ ہوئی تو بہرحال دھونے کی وجہ سے پاکی حاصل ہو جائے گی؛ اور اگر نجاست اچھی طرح جذب ہو گئی ہو اور آثار و قرائن اس پر شاہد ہوں تو اب امام محمدؒ کے نزدیک اس کے پاک کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

زیلعیؒ نے ایک اور مسئلہ پختہ اینٹ کے بارے میں ولوالجی سے نقل کیا ہے، واضح ہو کہ اینٹ کے اندر سیال اشیا کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، اور کم چیزیں ہیں کہ ان میں جذب کرنے کی اتنی صلاحیت پائی جاتی ہو، فرماتے ہیں کہ اگر اینٹ میں نجاست لگ جائے اور اینٹ اس نجاست کو جذب کرے تو اینٹ اگر پرانی اور زیر استعمال رہی ہو تو بیک وقت تین بار دھو دینا کفایت کر جائے گا اور اگر اینٹ نئی ہو تو اس طرح دھویا جائے کہ ہر دفعہ دھونے کے بعد اسے خشک کر لیا جائے، پھر دوبارہ سہ بارہ اسی طرح دھویا جائے: "وإن كان حديثا يغسل ثلاث مرات و يجفف على أثر كل مرة"[2]

عالمگیری میں نقل کیا گیا ہے کہ اگر گیہوں میں شراب گر جائے، جذب ہو جائے اور گیہوں اس کی وجہ سے پھول جائے تو اس کی پاکی کا طریقہ یہ ہے کہ اسی طرح اس کو پانی میں پھولایا اور خشک کیا جائے اور اگر ابھی گیہوں کے پھولنے کی نوبت نہیں آئی ہو تو تین دفعہ صرف دھونے پر اکتفا کیا جائے۔[3]

ابن قدامہ مقدسیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے جو رائے نقل کی ہے، وہ وہی ہے جو امام محمدؒ کی ہے۔ فرماتے ہیں: اگر تل یا کوئی دانہ ناپاک پانی میں پھولا یا گیا، یہاں تک کہ وہ پھول گیا، تو اب وہ پاک نہیں ہو سکتا ہے: "إن نقع السمسم وشيئ من الحبوب فى الماء النجس حتى انفسخ و ابتل لم يطهر"[4]

---

(۱) تبیین الحقائق، ج ۱، ص ۷۶ (۲) ایضا۔

(۳) عالمگیری مع الخانیہ، ج ۱، ص ۴۲، باب احکام النجاسہ۔

(۴) المغنی، ج ۱، ص ۳۸۔

اس مسئلہ پر سب سے زیادہ وضاحت اور مختلف صورتوں کا تجزیہ کر کے ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے گفتگو کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے:

"جس چیز میں نجاست لگی ہے، یا تو وہ ایسی چیز ہوگی، جو اجزائے نجاست کو بالکل ہی جذب نہ کر سکے، یا کچھ جذب کرے، یا بہت زیادہ جذب کرے، اگر بالکل جذب نہ کر سکے، جیسے پتھر، تانبے وغیرہ کے برتن تو اس کی پاکی اس طرح ہوگی، کہ یا تو محسوس طور پر نجاست زائل ہو جائے، یا دھونے کی مطلوبہ تعداد پوری ہو جائے، اسی طرح جو معمولی طور پر جذب کی صلاحیت رکھتا ہو، جیسے بدن، موزے، جوتے کا بھی یہی حکم ہے، اور اگر اس کے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہو تو اگر اس کو نچوڑنا ممکن ہو اور نجاست دیکھنے میں آتی ہو (مرئی)، تو اسے دھویا جائے اور اس نجاستِ محسوس کے ختم ہونے تک نچوڑا جائے اور اگر نجاست دیدنی نہ ہو تو تین دفعہ دھویا جائے اور ایک قول کے مطابق تینوں بار اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق صرف ایک بار نچوڑنے پر اکتفاء کیا جائے، اور اگر وہ شئی ایسی ہو کہ اس کا نچوڑا جانا ممکن نہ ہو تو وہ اچھی طرح نجاست کو جذب کر جائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تین دفعہ اسے پانی میں پھولا کر خشک کرنے، یا پکا کر خشک کرنے سے پاک ہو جائے گا، اور امام محمدؒ کے نزدیک کبھی پاک نہ ہوگا۔"

اخیر میں کاسانیؒ نے مجتہدانہ مذاق کے مطابق بصیرت مندانہ فیصلہ فرمایا، کہ امام محمدؒ کا قول قیاس سے قریب ہے اور امام ابو یوسفؒ کے قول میں امت کے لئے سہولت اور وسعت ہے:

"وما قالہ محمد اقیس وما قالہ ابو یوسف أوسع"[1]

فقہاء کے ان اقوال و آراء سے درج ذیل باتیں منقح ہوتی ہیں:

(۱) کسی شئی کے پاک اور ناپاک ہونے کا مدار اس پر ہے کہ نجاست اس میں پیوست ہوئی ہے،

---

(۱) بدائع والصنائع، ج ۱، ص ۸۸ - ۸۹ - شامیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہے، والثانی اوسع وبہ یفتی - رد المحتار، ج ۱، ص ۲۲۱ -

یا نہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی نجاست کے اثر انداز ہونے کا اندازہ محسوس طور پر ہو جاتا ہے اور کبھی تخمین اور گمان پر اس کی بنیاد رکھی جاتی ہے ۔

(۲) تطہیر کا اصل مقصود نجاست کا ازالہ اور اس کا دور کرنا ہے' اس لئے مختلف اشیاء کیلئے تطہیر کے الگ الگ طریقے ہو سکتے ہیں ۔

(۳) نجاست کے باقی رہنے ، یا نہ رہنے کی علامت عام طور پر فقہاء نے رنگ ، بو ، مزہ کی تبدیلی کو قرار دیا ہے ، اسی لئے ابن ہمامؒ کے بیان کے مطابق اگر شراب میں پکی ہوئی مرغی کو تین بار پاک پانی میں پکا دیا جائے اور اس میں شراب کی بو باقی نہ رہے تب ہی وہ گوشت پاک ہو سکے گا ۔

(۴) حیوانی بدن منجملہ ان چیزوں کے ہے ، جس میں کسی چیز کو جذب کی محض معمولی صلاحیت ہوتی ہے ۔ کاسانیؒ نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا مشاہدہ بھی ہے ۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ موت کے بعد روح کی صلاحیت نسبتاً کم ہو جاتی ہے اور گرم چیز میں ابالنے کی وجہ سے گوشت اپنے ساتھ ابلنے والی چیزوں کو جذب کر لیتا ہے ، اسلئے اگر مرغ کو ذبح کرنے کے بعد نجاست نکالے بغیر ابلتے پانی میں ڈال دیا جائے اور ابالا جائے تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس نجاست کا اثر گوشت کے دوسرے حصوں میں منتقل ہو جائے ۔

(۵) یہ بات بھی ذہن میں رکھی جانی چاہئے کہ اگر مسلمان کا کوئی مال حلت اور پاکی کا کوئی پہلو رکھتا ہو تو اتلافِ مال سے بچنے کے لئے حدودِ شرع میں رہتے ہوئے اس کی گنجائش پیدا کی جائے گی ۔ کاسانیؒ نجاست وطہارت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں : " وکذا یؤدی إلی اتلاف اموال والشرع نہانا عن ذلک فکیف یامرنا بہ "[1]

ان امور کی روشنی میں یہ بات غور طلب ہے کہ موجودہ زمانہ میں ذبح کے فوراً بعد مرغ کو جتنی دیر ابلتے ہوئے پانی میں رکھا جاتا ہے ، کیا اس کی وجہ سے نجاست کا اثر اس میں منتقل ہو جاتا ہے ؟ اور اگر منتقل ہو جاتا ہے تو اتنا خفیف کہ جس کو تین بار دھو کر پاک کیا جا سکے ، یا نجاست اس میں

---

(۱) بدائع الصنائع ، ج ۱ ، ص ۸۸ - ۸۹ -

اس درجہ جذب ہو جاتی ہے کہ امام محمدؒ کے مسلک پر پاک ہی نہ ہو سکے، اور امام ابو یوسفؒ کے مسلک پر تین بار پاک پانی میں پکائے بغیر پاک نہ ہو ——— میرے نزدیک جو صورت مروج ہے، اس میں مرغ کو اتنی دیر پانی میں نہیں رکھا جاتا کہ اس کی وجہ سے گوشت میں نجاست جذب ہو جائے، اس لئے یہ تو ٹھیک ہے کہ احتیاطاً ہم اس کے دھونے کو ضروری قرار دیں، لیکن اس کا محض دھو لینا کافی ہوگا، نہ کہ امام محمدؒ کے مسلک پر بالکل ہی پاک ہوگا، یا امام ابو یوسفؒ کے قول پر تین دفعہ ابالنا ضروری ہوگا، اسلئے کہ اس بات کا تجربہ ہے کہ ایسی صورت میں مرغ کے گوشت کے مزے اور بو میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر جو فقہی جزئیات ذکر کئے گئے ہیں، ان میں "طبخ" یعنی پکانے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، پکانے اور معمولی طریقے پر ایسی حرارت پہونچانے، جس سے بال وغیرہ نکل جائیں، کے درمیان کتنا فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ غالباً خاتم الفقہاء والمحققین علامہ ابن ہمامؒ نے سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کی اور فرمایا کہ اگر مرغی ابلتے ہوئے پانی میں پیٹ چاک کرنے سے پہلے ڈالی جائے تو امام محمدؒ کے قول پر کبھی پاک نہ ہوگی اور امام ابو یوسفؒ کے قول پر تین دفعہ دھونے کی وجہ سے پاک ہو جائے گی۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس نے نجاست کو پی لیا ہو۔ وهو معلل بشربها النجاسة المتخللة فى اللحم بواسطة الغليان[1]"۔

چنانچہ بعد کے فقہاء میں شرنبلالیؒ نے مراقی الفلاح میں اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

لو القيت الدجاجة حال غليان الماء	مرغی جس کا پیٹ چاک نہ کیا گیا ہو، یا اوجھ جس کی غلاظت
قبل أن يشق بطنها لتنتف او كرش قبل	نکالی نہ گئی ہو، اگر اس کو جوش مارتے ہوئے پانی میں بال نکالنے
ان يغسل إن وصل الماء إلى حد الغليان	کے لئے ڈال دیا جائے تو اگر پانی غلیان کی حد تک پہونچ گیا ہو
ومكثت فيه بعد ذالك زمانا يقع فى مثله	اور مرغی اتنی دیر تک پڑی رہی کہ اتنے وقت میں پانی سرایت
التشرب والدخول فى باطن اللحم لا يطهر	کر جائے اور گوشت میں داخل ہو جائے تو وہ کبھی پاک نہ ہوگا،
ابداً الا عند ابي يوسفؒ كما مر فى اللحم	البتہ امام ابو یوسفؒ کے یہاں پاک ہو جائے گا، جیسا کہ گوشت کے

(1) فتح القدير، ج ۱، ص ۱۸۶۔

"وإن لم يصل الماء إلى حد الغليان أو لم تترك فيه إلا مقدار ما تصل الحرارة إلى سطح الجلد لانحلال مسام السطح عن الريش والصوف فطهر بالغسل ثلاثاً"(۱) بیان میں گزر چکا ہے ——— اور اگر پانی میں جوش نہ آیا ہو، یا اس میں اتنی ہی دیر چھوڑا گیا ہو کہ اس کی حرارت جلد تک پہونچ جائے، تاکہ بال اور اون سے متعلق مسامات کھل جائیں تو تین بار دھونے سے پاک ہو جائے گا۔

اسی کو اختصار کے ساتھ طحطاویؒ نے بھی لکھا ہے: "وأما وضعها بقدر انحلال المسام لنتف ريشها فتطهر بالغسل"(۲)۔

پس حاصل یہ ہے کہ:

(۱) اس بات کی سعی کی جانی چاہئے کہ ایسا نظم ہو کہ آلائش نکالنے کے بعد مرغ پانی میں ڈالا جائے اور ہر بار نیا پانی استعمال کیا جائے۔

(۲) احتیاط یہ ہے کہ لوگ حتی المقدور مرغ کی صفائی کا نظم اپنے طور پر کیا کریں، تاکہ اس کی نوبت نہ آئے ——— اور اگر اہلِ پیشہ سے صفائی کرائی جائے تو اس سلسلے کی نزاکتوں اور جزئیات کا خاص خیال رکھا جائے اور اپنے سامنے پوری احتیاط کے ساتھ صفائی کا کام کرا جائے۔

(۳) مروجہ صورت میں احتیاطاً اس گوشت کو ناپاک ہی کہا جائے گا۔

(۴) لیکن تین دفعہ گوشت کو دھو دینا کافی ہوگا اور وہ ناقابلِ تطہیر نہ ہوگا۔

(۵) مگر یہ اس وقت ہے، جب کہ گوشت میں آنت کی آلائش اور نجاست کی بو پیدا نہ ہوئی ہو اگر بو پیدا ہو جائے تو احتیاط اسی میں ہے کہ جو امام محمدؒ کا قول ہے، کہ اس کا استعمال نہ کیا جائے۔

(۶) بعض مواقع پر بطور خود مرغ ذبح کیا جاتا ہے اور گرم پانی میں ڈالنے کے بجائے، لوگ آگ پر جھلسا کر بال وغیرہ صاف کرتے ہیں، اس کا بھی وہی حکم ہے جو گرم پانی میں ڈالنے کا ہے، اسلئے پہلے جسم کی آلائش کو نکال دینا چاہئے، پھر جھلسانا چاہئے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب۔

---

(۱) مراقی الفلاح، ص ۸۶

(۲) حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۸۶۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی عثمان ذوالنورینؓ کا ایک قابلِ توجہ حصہ

مولانا علاء الدین ندوی

مولانا اکبر آبادی مرحوم کی کتاب پر یہ ناقدانہ مضمون ان کی وفات سے قبل کا ہے، مگر چونکہ اس میں ایک ایسے نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کی ضرورت اب بھی باقی ہے اسلئے یہ مضمون مناسب ترمیم و حذف کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے (ع ح رحمانی)

جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی نئی تصنیف "عثمان ذوالنورین" جب ہاتھوں میں آئی تو اسے دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اردو زبان، جس عظیم ہستی کی سیرت و سوانح سے اب تک تہی دامن تھی اور جس کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، خاص کر ایسے وقت میں جب کہ امتِ مسلمہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں عجیب مخمصے میں گرفتار اور حیران و سرگرداں چوراہے پر کھڑی ہو، اس لئے کہ ادھر چند سالوں کے اندر اردو میں بعض ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن کو پڑھ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب شکوک ذہنوں میں ابھرتے اور پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ ان کتابوں کے جوابات بھی لکھے گئے ہیں اور ان میں بعض بہت قابلِ قدر اور لائق ستائش ہیں۔ فجزاہم اللہ خیرًا۔

"عثمان ذوالنورین" کو دیکھ مسرور ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اردو میں حضرت کی سوانح ایک ممتاز علمی شخصیت کے قلم سے نکلی ہے اور جس کمی کا شدت سے احساس تھا وہ تو پوری ہوئی ہی بعض کتابوں کے ذریعہ جو تذبذب کا عالم پیدا ہوا، اس کا ازالہ بھی اس کتاب سے ہو جائے گا۔ لیکن دورانِ مطالعہ جب کتاب کے ص ۲۶ پر پہونچا تو اس صفحہ کو پڑھ کر حد درجہ مایوسی ہوئی اور اس میں مرقوم بوالعجبی کو دیکھ کر حیرت اور صدمہ کا ملا جلا احساس بڑی شدت سے پیدا ہوا، بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نئے صدمے و دوچار ہوا اور بات کسی طرح عقل کے لئے قابلِ قبول نہ بن سکی۔

چنانچہ ایک عریضہ مولانا کو لکھا، انہوں نے اس کا جواب مرحمت فرمایا، جس سے بات سلجھنے کے بجائے اور الجھ گئی، میں نے اس خط کا جواب پوری تفصیل سے دیا، جس کے بارے میں میرا اپنا خیال یہی ہے کہ وہ ان کی توقع کے بالکل خلاف ان تک پہونچا ہو گا۔

کتاب عثمان ذوالنورین کے ص ۲۶-۲۷ پر مندرجہ عبارت درج ذیل ہے:

"اس سلسلہ میں پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرما دیا تھا کہ جو شخص جان بوجھ کر آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا، لیکن اس کے باوجود وضع حدیث کا فتنہ عہد صحابہ میں پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ صحیح مسلم میں عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے فرماتے ہیں: "جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت غلط بیانی نہیں کی جاتی تھی، ہم احادیث نبوی کی روایت کرتے تھے، لیکن جب سے لوگ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے ہیں، ہم نے حدیث کا روایت کرنا ترک کر دیا ہے۔ اس فتنہ کے وجوہ واسباب درج ذیل ہیں:

انسان کی فطرت ہے کہ جب اپنے کسی خیال یا رائے کو مؤثر طریقہ پر اور قوت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے تو بعض بڑے لوگوں کے اقوال کو اپنی تائید میں پیش کرتا اور ان کا حوالہ دیتا ہے، اور اگر سچ مچ کوئی ایسا قول موجود نہیں ہوتا تو خود کوئی قول اپنے جی سے گھڑ کر کسی بڑی شخصیت کی طرف اسے منسوب کر دیتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عہد صحابہ میں ایمان وعمل کے اعتبار سے سب لوگ یکساں نہیں تھے، بلکہ اس عہد میں وہ لوگ بھی تھے جن کی نسبت قرآن میں فرمایا گیا تھا: قالت الاعراب اٰمنا۔ الآیہ۔

پس جو لوگ اس آیت کا مصداق تھے وہ مسلمان ضرور تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات ہونے کے باعث صحابہ میں شمار بھی ہوتے تھے، لیکن طویل صحبت وتربیت یافتہ نبوی صحابہؓ جیسا ان میں نہ ورع وتقویٰ تھا اور نہ اپنے قول وعمل میں ان کی طرح محتاط تھے۔

اسی بنا پر (نیک نیتی سے سہی)، جب ان کو اپنی رائے یا خیال کو مؤکد کرنا ہوا انہوں نے بے تکلف ایک قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا، خواہ انہوں نے یہ قول اپنے جی سے گھڑا ہو، یا ان ہی کی طرح کسی غیر ذمہ دار شخص سے سنا ہو۔"

(عثمان ذوالنورین ص ۲۶-۲۷)

جناب مصنف کا یہ دعویٰ کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں خود صحابہؓ کے درمیان ایسے لوگ موجود تھے، یا پیدا ہو گئے تھے، جو وضع حدیث جیسے شنیع جرم کا ارتکاب کرتے تھے، اور فتنۂ وضع حدیث کی بنیاد صحابہ نے ڈالی تھی، باوجودیکہ: "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار" جیسی شدید وعید نبوی

ان کے سامنے تھی، پھر بھی ان میں بعض ایسے لوگ تھے جو اس وعید کو بھی خاطر میں نہ لائے ـــــــ ایسا دعویٰ ہے جس کے پیچھے نہ کوئی نقلی دلیل ہے اور نہ عقلی، اس کے برخلاف "الصحابۃ کلھم عدول" امت محمدیہ کا اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہی نہیں عقیدہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے جرح و تعدیل میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس اجماعی فیصلہ کے خلاف کسی ایک صحابیؓ کی شان میں اس طرح کی رائے زنی کی ہو، میری دانست میں مولانا کی یہ تحقیق نادرست، اہل سنت والجماعت کی تاریخ میں پہلی اور منفرد ہے، اس سے پہلے کسی صاحب علم و دین نے اس طرح کی جسارت نہیں کی ہے۔ اور جب: اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اهتدیتم۔ نیز۔ اللہ اللہ! فی اصحابی لا تتخذوهم من بعدی غرضا" جیسے ارشاداتِ نبوی سامنے ہوں تو کسی میں یہ جرأت ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مولانا نے وہ بات لکھ دی جسے کہنے کے لئے شاید آج تک کسی نے سوچا بھی نہ ہو

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول مسلم شریف سے نقل کیا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو عام علماء کے علم میں ہے اور واقعۃً صحابہ میں ایسے لوگ تھے جو موقع بے موقع حدیث گھڑ کر بیان کرتے تھے، حالانکہ یہ بات سو فیصد غلط اور حد درجہ گمراہ کن ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول جب نقل کیا گیا تھا تو حوالہ بھی دیا جاتا، پھر حضرت ابن عباسؓ کا جو جملہ اردو میں نقل کیا گیا ہے، اس کے کس لفظ سے یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اظہار خیال فرما رہے ہیں، اور اس کے کس لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں ایسے مجرم تھے، بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے باوجود مجھے تو کوئی لفظ ایسا نظر نہ آسکا۔

مولانا کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے وصال کے وقت حضرت ابن عباس کی عمر صرف تیرہ سال تھی اور ان کا شمار کم عمر صحابہ میں تھا، علم و فضل کی بات الگ ہے، انہوں نے خلفائے راشدین کا دور ہی نہیں حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور ۶۸ھ میں جب کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اکہتر سال کی عمر میں طائف میں سفر آخرت فرمایا، کیا اتنی طویل مدت میں تابعین کی جماعت تیار نہیں ہو گئی تھی؟ اور تابعین میں ایسا کوئی نہیں ہوا تھا جو روایت حدیث کی عمر تک پہونچا ہو، کیا یزید کے دربار میں ایسے لوگوں کی کمی تھی جو حدیثیں وضع کرتے تھے؟ آخر کس دلیل کی بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ حضرت ابن عباسؓ کا اشارہ حضرات صحابہؓ کی جانب ہے؟ حیرت اور شدید حیرت ہے کہ مولانا جیسے بلند پایہ صاحب علم کی نگاہوں سے یہ بات اوجھل رہ جائے، پھر آیت کریمہ

قالت الاعراب اٰمنا الایۃ۔ سے استدلال تو اور بھی ستم بالائے ستم ہے ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے ٭ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے

یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے کہ صحابہؓ میں تمام کے تمام علم و عمل اور عبادت و ریاضت میں یکساں نہ تھے، اور یہ کچھ اسی عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ بات ہر زمانہ میں رہی ہے، اور قیامت تک رہیگی۔ فضلنا بعضھم علی بعض اور فوق کل ذی علم علیم۔ اس کی بہت واضح دلیل ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا اور مطلب نکالنا کہ نعوذ باللہ جماعتِ صحابہ میں ایسے ناخدا ترس لوگ بھی تھے، جو برملا اور بلا تکلف گھڑ کر حدیثیں بیان کرتے تھے، قطعی غلط ہوگا۔ اگر صحابہ میں ایسے لوگوں کا وجود مان لیا جائے تو مولانا بتائیں کہ قرآن و حدیث کے پورے دفتر کی کیا حیثیت باقی رہ جائے گی؟ اور جب قرآن و حدیث ہی بے وقعت ہو جائیں تو دین و مذہب کا حشر واضح و معلوم۔

سورۂ نصر نازل ہوئی اور جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ تک یہ سورہ پہونچی تو فرمایا کہ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس سورہ سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی، بات بارگاہِ نبوت تک پہونچی، وہاں سے حضرت صدیق کی بصیرت کی تائید ہوئی، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ تمام صحابہؓ قرآن فہمی کی دولت سے محروم تھے، اسی طرح کسی کی کثرتِ عبادت کی بنا پر ان کے ساتھیوں اور معاصروں کو ورع و تقویٰ سے عاری سمجھنا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ان کے اندر عمل کا فقدان تھا، ایسی بات ہے جو مولانا اکبر آبادی صاحب ہی کہہ اور لکھ سکتے ہیں۔

مولانا کی خدمت میں میں نے اپنی معروضات لکھ بھیجیں، اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، ان کے ہی الفاظ میں یہ ہے:

"رہا وہ مسئلہ جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے تو اس کے متعلق حسب ذیل معروضات پر غور کیجئے:

۱۔ "الصحابۃ کلھم عدول" یہ نہ قرآن کی آیت ہے اور نہ کوئی حدیث، بلکہ محدثین کا ایک عام قول ہے، پھر اس میں بھی کل افرادی نہیں ہے، بلکہ کل مجموعی ہے۔

۲۔ دوسری روایت: اصحابی کالنجوم اس کو محدثین نے ضعیف کہا ہے اور بعض نے اس کو موضوع بھی قرار دیا ہے۔ دیکھئے: التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح، مؤلفہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ص۲۷

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول جو میں نے نقل کیا ہے، اس کے لئے ملاحظہ فرمائیے صحیح مسلم جلد اول ص۱۰۔

۴۔ میں نے وہ لوگ جو کہ قالت الاعراب اٰمنا کے تحت میں آتے ہیں ان کے متعلق اس خدشہ کا اظہار کیا ہے اور وہ بھی بریکیٹ میں میں نے لکھ دیا ہے (اگرچہ نیک نیتی سے سہی) اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ بعض حضرات ترغیب و ترہیب کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی چیز کو منسوب کر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

۵۔ میں نے گویا صحابۂ کرامؓ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک وہ صحابہ ہیں جو اعراب کا مصداق نہیں ہیں، ان صحابہ سے یقیناً وضع حدیث ناممکن ہے اور دوسرے وہ جو قالت الاعراب کا مصداق ہیں، ان کا معاملہ دوسرا ہے۔

۶۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ وہ لوگ جو مرتد ہو گئے تھے اور وہ لوگ جو مانعین زکوٰۃ میں شامل تھے، جن سے حضرت ابو بکر کو جنگ کرنی پڑی یہ کون حضرات ہیں؟

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروان کے والد حکم کو مدینے سے جلا وطن کر دیا تھا، حضرت عثمان نے جو ان کو مدینے میں داخلے کی اجازت دی تو اس پر شور مچ گیا، اس کی کیا وجہ تھی؟

۸۔ سعد بن عبادہ بنو سقیفہ میں حضرت ابو بکرؓ کی خلافت سے ناراض ہو کر مدینہ چھوڑ کر چلے گئے اور شام میں ایسے آباد ہوئے کہ پھر ادھر کا رخ ہی نہیں کیا، یہ آخر کیا تھا؟

۹۔ حضرت عمر نے تاکید کر دی تھی کہ تمیم داری صرف میری موجودگی میں مسجد کے اندر وعظ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا سبب کیا تھا؟

۱۰۔ احادیث کے ذخیرہ میں اسرائیلیات نے جو حشر برپا کیا ہے، اہلِ علم پر ظاہر ہے۔ ان اسرائیلیات کا سرچشمہ کہاں ہے؟

امید ہے کہ آپ مذکورہ بالا معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

آپکے توجہ دلانے پر میں نے اپنی کتاب کا صفحہ متعلقہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ بعض الفاظ قلم سے ایسے نکل گئے ہیں جو احتیاط کے خلاف ہیں، انشاء اللہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دوں گا۔ ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کتاب کا مسودہ حرفاً حرفاً پڑھا ہے اور مہر تصدیق ثبت کی ہے، اسی طرح ہندوپاک میں سیکڑوں علماء نے اب تک اس کتاب کو آپ کی طرح "سرسری" طور پر نہیں، بلکہ توجہ

اور غور سے پڑھا ہے اور کسی نے اب تک کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا، نہ قولاً نہ تحریراً:

میرا مقصد اپنے خط سے یہ ہرگز نہ تھا کہ میں ان سے کوئی مناظرہ کروں یا بحث و تمحیص کی راہ کھولوں بلکہ مقصد روزِ اول سے یہی تھا کہ حضرات صحابۂ کرامؓ کے دامنِ تقدس پر کتاب کی مندرجہ بالا عبارت سے جو حرف آتا ہے اور جس سے ان کی عظمت و اہمیت مجروح ہوتی ہے اور امت کے اجماعی اور متفقہ عقیدہ کے خلاف ایک نئی بات سامنے آتی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ لیکن افسوس کہ میری یہ خواہش مولانا کے جواب سے پوری نہ ہو سکی، بلکہ اس کے برعکس کچھ نئے شگوفے ہی سامنے آئے، جو اتنے بڑے ذی علم شخص کے مرتبہ سے بہت فروتر ہے۔ مجھے مولانا کے جواب سے بڑی مایوسی ہوئی اور اس سے اطمینان تو کیا حاصل ہوا، الٹا خلجان و اضطراب ہی میں اضافہ ہو گیا

اس لئے میں نے پھر مولانا کو ان کے اس خط میں تحریر کردہ دس نکتوں کے جوابات دیئے جو جزوی ترمیم اور حک و اضافہ کے ساتھ درج ذیل ہیں:

مجھے مولانا سے یہ عرض کرنا ہے کہ وضع حدیث کا کام کسی صحابی سے نہیں ہوا اور مولانا کے خط کے باوجود اس پر میرا اصرار ہے اور یہ تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے زندگی کی آخری سانس تک اس اصرار پر قائم و دائم رکھے۔ الصحابۃ کلھم عدول کے بارے میں میں نے ہرگز یہ نہیں لکھا تھا کہ یہ قرآنی آیت یا حدیث ہے، بلکہ یہ عرض ہے کہ امت محمدیہ کا اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہے، علمائے جرح و تعدیل میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس اجماعی فیصلہ کے خلاف کسی ایک صحابی کی شان میں اس طرح کی رائے زنی کی ہو۔ اصحابی کالنجوم والی روایت کو ابن حزم نے موضوع اور باطل کہا ہے، جیسا کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں مرقوم ہے[1]۔ مگر مولانا نے جو حوالہ نقل فرمایا ہے اور جس طرح نقل فرمایا ہے، مجھے ان کے لکھے ہوئے حوالے میں یہ بات نہیں ملی۔ بہرحال مشکوٰۃ شریف کے باب مناقب الصحابۃ میں بعض روایتیں ایسی ہیں جو اصحابی کالنجوم سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے اگر اصحابی کالنجوم موضوع اور باطل بھی ہو تو اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا، پھر اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضاً اس سے زیادہ صاف اور واضح ہے، اور الصحابۃ کلھم عدول کی بنیاد بھی اور یہی بنیاد اتنی واضح اور روشن ہے کہ مزید کچھ کہنا بے سود ہے اس کے ماسوا

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جلد پنجم ص ۵۲۳۔

مولانا نے کلهم عدول میں کل کی جو تقسیم افرادی اور مجموعی کے لفظوں سے فرمائی ہے، میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر اس تقسیم کی بنیاد اور ضرورت کیا ہے؟ اور اگر یہ تقسیم ضروری ہو تو اسے افرادی کیوں نہیں تسلیم کیا جائے، جب کہ سارے شواہد اسی کے مؤید ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جس روایت کا ترجمہ یا مفہوم کتاب میں نقل کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

انا کنا نحدث عن رسول الله علیه وسلم اذ لم یکن یکذب علیه فلما رکب الناس الصعب والذلول ترکنا الحدیث عنه۔	جس زمانہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہ باندھا جاتا تھا، ہم لوگ حدیثیں بیان کرتے تھے، لیکن جب لوگ بلا فرق و امتیاز اچھے برے سبھی روایتیں بیان کرنے لگے تو ہم نے روایت حدیث ترک کر دیا۔

. . . .

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں "باب النهی عن الروایة عن الضعفاء والاحتیاط فی تحملها" کے تحت اس حدیث کو نقل فرمایا ہے، اس کے علاوہ دو اور روایتیں حضرت موصوف سے اسی باب میں امام صاحب نے نقل کی ہیں، قدر مشترک کے طور پر خط کشیدہ الفاظ تینوں روایتوں میں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشاد میں کوئی ایک لفظ ایسا نظر نہیں آ رہا ہے، جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ان کا اشارہ حضرات صحابہؓ کی جانب ہے، بلکہ اگر الفاظ پر سطحی نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان کا اشارہ صریحی طور پر صحابۂ کرامؓ کے بعد والے غیر محتاط لوگوں کی جانب ہے اور حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اسی باب میں انہوں نے جو سب سے پہلی روایت نقل فرمائی ہے، اس سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرةؓ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال سیکون فی اخر امتی اناس یحدثونکم بما لم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم وایاهم۔	حضرت ابو ہریرہؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اخیر زمانہ میں میری امت میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تم سے اس طرح کی روایتیں بیان کریں گے، جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا، نہ تمہارے آباؤ اجداد نے، تم ان سے مکمل طور پر بچتے رہنا۔

. . . .

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح الملہم" جلد اول صفحہ ۱۲۷ میں اس حدیث کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:

قوله بمالم تسمعوا الخ ای یقولون ویرودون اشیاء لیست هی فیمالم یزل یعرفه المسلمون خلفا عن سلف مع ان الله تعالیٰ اکمل دینه ووعد بحفظه ونشره ولم یترک الی ضیاع جزء من اجزاءه فاین کانت هذه الغرائب فی القرون الاول۔

یعنی وہ ایسی باتیں کہیں گے اور ایسی روایتیں بیان کریں گے، جو ان روایتوں میں نہ ہوں گی، جنہیں عام مسلمان اپنے سلف سے برابر جانتے اور سنتے چلے آرہے ہوں گے، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مکمل فرما دیا ہے، اس کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا وعدہ فرمایا ہے اور اجزائے دین میں سے کسی ایک جزء کو بھی ضائع ہونے کے لئے نہیں چھوڑا ہے، تو یہ نامانوس باتیں قرون اولیٰ میں کہاں تھیں؟

اب اگر حضرت ابوہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایتوں کے الفاظ پر اور حضرت عثمانی رحمۃ اللہ کی شرح پر ادنیٰ تامل بھی کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اشارہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کی جانب بھی نہیں ہے، بلکہ بعد والے لوگوں کے بارے میں وہ فرما رہے ہیں، حضرات صحابہ کا دامن اس داغ سے بالکل پاک ہے۔ شارح کا آخری جملہ فاین کانت هذه الغرائب فی القرون الاول تو اور بھی بات کو منقح اور صاف کئے دے رہا ہے، ہاں جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا اور محسوس فرمایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کے لوگ الٹی سیدھی روایتیں بیان کرنے لگے ہیں اور غلط طور پر روایتوں کی نسبت جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تو انہوں نے فرمایا اور بالکل صحیح فرمایا، اور جتنی صحیح بات یہ ہے کہ ان کا اشارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والے لوگوں کی جانب ہے، اتنی ہی بڑی زیادتی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر یہ ہوگی کہ ان کے اس قول کا محمل و مصداق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو قرار دیا جائے۔

کتاب "عثمان ذوالنورین" میں فاضل مصنف کا یہ تحریر کرنا: —— اسی بنا پر (نیک نیتی سے سہی) جب کبھی ان کو اپنی رائے یا خیال کو مؤکد کرنا ہوا، انہوں نے بے تکلف ایک قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا، خواہ انہوں نے یہ قول اپنے جی سے گھڑا ہو، یا انہیں کی طرح کسی غیر ذمہ دار شخص سے سنا ہو" محض دعویٰ ہے، جس کی نہ کوئی دلیل دی گئی ہے اور نہ نظیر پیش کی گئی ہے، کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے کسی ایک موقع پر بھی بے اصل روایت بیان کی اور اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کر دی ہو، کاش مولانا نے خطبہ ہی میں اس کی کوئی نظیر پیش کر دی ہوتی اور نظیر بھی کہاں سے پیش

کی جاتی، جب کہ اس کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو میں معصوم نہیں سمجھتا، کہ عصمت انبیاء علیہ کے ساتھ مخصوص ہے، وہ زر خالص کی مانند ہیں، عملی لغزشیں ان سے ہو سکتی ہیں، لیکن عمداً (نیک نیتی سے ہی سہی) کذب علی النبی کا جرم عظیم ان سے سرزد ہونا محال ہے۔ خاص طور پر جب کہ: من کذب علی متعمدا (الحدیث) ان کے سامنے ہو، اسی طرح کسی غیر ذمہ دار شخص سے سن کر بھی ایسا کرنا ان کی جلالت شان کے منافی ہے، کیونکہ حفص بن عاصمؓ سے مروی روایت: کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے (مسلم، فتح الملہم، جلد اول ص۱۲۵) بھی ان کے پیش نظر تھی، ان روایتوں کے ہوتے ہوئے میری ناقص عقل اس کو باور کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ و تیار نہیں کہ ان سے اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ حرکت سرزد ہو اور وہ ان روایتوں کو پس پشت ڈال کر ایسی غیر محتاط راہ اپنائیں جس سے ایک عام دین دار آدمی بھی ہزار بار پناہ مانگے، چہ جائیکہ صحابۂ کرامؓ ——— دوسری بات مجھے آیت کریمہ: قالت الاعراب اٰمنا سے متعلق کہنا ہے۔ مولانا نے کتاب میں تحریر کیا ہے:

"انسان کی فطرت ہے کہ جب اپنے کسی خیال یا رائے کو موثر طریقہ پر اور قوت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے، تو بعض بڑے لوگوں کے اقوال کو اپنی تائید میں پیش کرتا اور ان کا حوالہ دیتا ہے اور اگر سچ مچ کوئی ایسا قول موجود نہیں ہوتا تو خود کوئی قول اپنے جی سے گھڑ کر کسی بڑی شخصیت کی طرف منسوب کر دیتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عہد صحابہؓ میں ایمان و عمل کے اعتبار سے سب لوگ یکساں نہیں تھے، بلکہ اس عہد میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی نسبت قرآن میں فرمایا گیا تھا: "قالت الاعراب اٰمنا" الآیۃ۔"

پیش نظر گرامی نامہ میں فاضل مکتوب نگار نے اسی سلسلے میں درج ذیل بات بھی تحریر کی ہے:-

"میں نے گویا صحابۂ کرامؓ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک وہ صحابہ ہیں جو اعراب کا مصداق نہیں ہیں، ان صحابہؓ سے یقیناً وضع حدیث ناممکن ہے اور دوسرے وہ جو قالت الاعراب کا مصداق ہیں، ان کا معاملہ دوسرا ہے۔"

اس آیت سے متعلق چند مفسرین کی بیان کردہ تفسیروں کو نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا، خلاصہ کے طور پر ان کو دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول منافقین بنی اسد کے سلسلہ میں ہوا۔ پہلے یہ تفسیریں ملاحظہ ہوں

قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں آیت: قالت الاعراب اٰمنا کے تحت لکھتے ہیں:

"گنوار کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے، یہ آیت بنی اسد کی ایک جماعت سے متعلق نازل ہوئی، جو خشک سالی کے موقعہ پر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور انہوں نے کلمۂ شہادت کا زبان سے اظہار کیا، وہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے، ہم آپؐ کی خدمت میں اہل وعیال کو لے کر حاضر ہوئے ہیں اور جس طرح فلاں قبیلہ کے لوگوں نے آپؐ سے جنگ کی ہے ہم نے نہیں کی .... اور وہ احسان جتاتے ہیں (آپؐ فرما دیجئے کہ تم لوگ ایمان ہی نہیں لائے ہو) جب کہ ایمان نام ہے دل کی پختگی کے ساتھ تصدیق کرنے کا اور اس پر دل کے مطمئن ہونے کا، حالانکہ یہ چیز تم کو حاصل نہیں ہوئی ہے، ورنہ تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام لانے اور جنگ سے باز رہنے کا احسان رکھتے (ہاں تم یہ کہو کہ ہم ظاہری طور پر مطیع ہو گئے ہیں) اسلئے کہ اسلام نام ہے ظاہری طور پر اطاعت کرنے، امن وصلح میں داخل ہونے، شہادتین کا زبانی طور پر اقرار کرنے اور جنگ و مخالفت ترک کر دینے کا۔ گویا نظم کلام یہ بتلا رہا ہے کہ یہ تو نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے، البتہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ظاہری طور پر ہم نے اطاعت تسلیم کرلی ہے (اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) یعنی تم یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے ہیں، حالانکہ تمہارے دل تمہاری زبانوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں، اس کے بعد بھی (اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہنا مان لو، نفاق سے پوری طرح دست بردار ہو کر مکمل اخلاص کے ساتھ ....."[1]

اس طویل اقتباس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آیت تمام تر منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اپنی اس تفسیر میں قاضی منفرد نہیں ہیں، علامہ زمخشریؒ نے اپنی تفسیر کشاف میں بھی یہی لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد "قالت الاعراب اٰمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا" نظم کلام اولاً ان کے دعویٔ ایمان کی تکذیب کر رہا ہے اور جس چیز کی جانب وہ اپنی نسبت کر رہے ہیں، اس کو بھی دفع کر رہا ہے، یعنی کہا یہ جا رہا ہے کہ آپؐ فرما دیجئے کہ تم صاحب ایمان ہو ہی نہیں ہو، ہاں یہ کہو کہ ظاہری طور پر ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے، ایسی صورت حال میں جب کہ تمہاری

---

(۱) بیضاوی، سورۂ حجرات۔

زبانوں سے تمہارے دلوں کی ہم آہنگی و موافقت ثابت نہیں ہو رہی ہے"۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی مشہور تفسیر میں اس آیت میں مذکور لوگوں کو جماعت منافقین میں شمار نہیں کیا ہے، بلکہ وہ انہیں کمزور ایمان والے مومنین قرار دیتے ہیں، لیکن انہوں نے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نقل فرمائی ہے، جو ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی رجحان اسی طرف ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو منافق تھے، وہ ایمان کا زبان سے اظہار تو کرتے تھے، مگر درحقیقت مومن نہ تھے"۔[2]

اپنے اکابر میں حضرت تھانوی و حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلوی رحمہما اللہ نے بھی وہی لکھا ہے جو قاضی بیضاویؒ، امام بخاریؒ اور علامہ زمخشریؒ نے لکھا اور فرمایا ہے، بلکہ حضرت تھانویؒ نے تو بیضاوی اور کشاف کے مقابلے میں اور بھی زیادہ تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اور آیت کو منافقین سے متعلق بتلایا ہے۔ بات اگرچہ طویل ہو جائے گی، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی عبارت نقل کر دی جائے۔

"قالت الاعراب امنا - تا - ان اللہ غفور رحیم - یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آکر جو ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہیں، یہ اس میں کئی امر قبیح کے مرتکب ہوتے ہیں، ایک تو کذب کہ بلا تصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر اور منفی ہے، جیسا عنقریب آتا ہے: ولما یدخل الایمان لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے، اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے، لیکن اب بھی) اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہوں گے محض اس وقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو کہ اس وقت کے اعتبار سے گذشتہ ہو گا) ذرا بھی کم نہ کرے گا (بلکہ سب کا پورا پورا ثواب دے گا) بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔[3]

---

(۱) کشاف، سورۂ حجرات (۲) تفسیر ابن کثیر جلد ۴ سورۂ حجرات (۳) بیان القرآن سورۂ حجرات۔

ان تمام پر مستزاد فاضل مصنف نے اس آیت کا خود جو ترجمہ فرمایا ہے اسے بھی ملاحظہ کیا جائے:

"اعراب کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے ہیں، اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، لیکن ہاں کہو کہ تم نے اطاعت قبول کرلی ہے، درآنحالیکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو تو تمہارے عملوں میں سے اللہ کچھ کم نہیں کرے گا، بے شبہ اللہ غفور و رحیم ہے"(۱)

کتاب صدیق اکبرؓ کے اسی صفحہ میں یہ بھی مرقوم ہے:

"ان اعراب نے اسلام کی ظاہری شوکت و سطوت اور اس کے سیاسی اقتدار و استیلاء کو دیکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے، لیکن درحقیقت ایمان اب تک ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے"

ان تمام اقتباسات سے اس کے سوا اور کیا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں مذکور لوگ وہ ہیں جنہوں نے صرف زبان سے اسلام کا اقرار کیا تھا اور ایسی ضرورت و مجبوری آپڑی تھی جس کی بنا پر ان کو یہ روش اپنانا پڑی، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان کے دل دولتِ ایمان سے بالکل تہی اور زبان و دل کے درمیان مشرق و مغرب کی دوری حائل تھی۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے حافظ ابن کثیرؒ کی رائے مان بھی لی جائے تو اس کا ثبوت جناب کے ذمہ رہتا ہے کہ کسی ایک صحابی کے متعلق ثبوت فراہم کیا جائے جس سے یہ ثابت ہو کہ ترغیب و ترہیب یا زیبِ داستان کے لئے اپنے جی سے گھڑ کر روایتیں بیان کرتے تھے، یا اپنی مانند کسی غیر ذمہ دار کی بیان کردہ روایتوں کو نقل کر دیا کرتے تھے۔

ان تمام مفسرین کی تفسیروں کو دیکھنے کے بعد اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ ہم اس آیت کا مصداق منافقین کو قرار دیں اور اس کی ضرورت مطلقاً باقی نہیں رہتی کہ درمیان میں ایک کمزور ایمان والے مومنین کی جماعت کو معرضِ وجود میں لاکر اسے اس آیت کا مصداق ٹھہرایا جائے۔

صحابۂ کرامؓ میں بلحاظ ایمان درجہ بندی پہلی مرتبہ مولانا اکبرآبادی کی تحریر میں دیکھی —— ایک جانب

---

(۱) صدیق اکبرؓ، ص ۱۴۴

قرآن مجید: محمد رسول اللہ والذین اٰمنوا معہ اشداء علی الکفار - اولٰئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی لھم مغفرۃ ولھم اجر عظیم - اور والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا - وغیرہ۔ آیتوں کے ذریعہ بلا استثناء وامتیاز جملہ اصحاب نبیؐ کی ستائش کر رہا ہے، ان کے لئے جنت کی بشارت دی جا رہی ہے اور دوسری جانب فاضل مصنف ان کو واضع حدیث قرار دے رہے ہیں۔ ع:

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

یہ تقسیم اگر کسی طرح ممکن ہوتی تو متقدمین نے جہاں اسماء الرجال میں اتنی بڑی بڑی کتابیں لکھیں اور پوری عرق ریزی و جاں فشانی کے بعد ان کتابوں کو مدون کیا، وہیں وہ صحابۂ کرامؓ کی تقسیم کرنے پر ہی اکتفاء نہ کرتے، بلکہ نام بہ نام ان کا تذکرہ بھی ضرور فرما دیتے۔

لہٰذا میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مولانا نے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دو گروہوں میں تقسیم فرمائی ہے کسی طرح بھی قابلِ قبول و تسلیم نہیں ہے۔ حکم بن العاصؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جلا وطن فرما دیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب ان کو مدینہ آنے کی اجازت دی تو شور مچ گیا، مولانا نے خط میں تو یہ تحریر فرما دیا، مگر کتاب عثمان ذوالنورین جس میں اس شور پر ہنگامہ کھڑا کرنا ضروری تھا، بالکل سناٹا نظر آتا ہے، اور شور مچنے کی بات تو دور رہی ہلکی آواز کا بھی سراغ کتاب سے نہیں ملتا۔ البتہ کتاب کے ص۲۰۵ کے حاشیہ میں یہ لکھا ہوا ہے: "اصابہ اور اسد الغابہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی حکم کو مدینہ آنے کی اجازت دے گئے تھے"۔

اسی طرح حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کا حضرت فاروق اعظمؓ کی جانب سے وعظ کہنے سے روکا جانا، تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ یہ ممانعت حضرت تمیم داری کے غلط روایتوں کو اپنے مواعظ میں بیان کرنے کے سبب تھی، کیا اس کے علاوہ اور کوئی وجہ اور مصلحت نہیں ہو سکتی ہے؟

مانعین زکوٰۃ یا مرتدین کے بارے میں خود مولانا اپنی گراں قدر تصنیف "صدیق اکبر" میں پوری تفصیل سے سیر حاصل بحث فرما چکے ہیں، اس کے سامنے رہتے ہوئے اس سلسلے میں مزید میرا کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔

حضرت سعد بن عبادہؓ کے بارے میں مولانا خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت سعد بن عبادہؓ بنو سقیفہ (یا سقیفہ بنی ساعدہ) میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے

ناراض ہوکر مدینہ چھوڑ کر چلے گئے اور شام میں ایسے آباد ہوئے کہ پھر ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ یہ آخر کیا تھا ؟"

اس کے لئے میں پھر مولانا کی توجہ "صدیق اکبر" کی جانب منعطف کرانا چاہوں گا، اور اس سے دو سطریں نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مولانا لکھتے ہیں :

"حافظ ابن حجر اور ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں ہی ان سے ناراض ہوکر شام میں جا بسے تھے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شام گئے ہیں"۔ (۱)

تفسیری روایتوں، یا اسرائیلیات نے چاہے جو ہنگامے مچائے ہوں اور جو قیامت برپا کی ہو، بہر حال ان کی نشاندہی بھی محدثین عظام نے فرمادی ہے۔ البتہ اس قیامت کا ذمہ دار صحابہؓ کو ٹھہرانا قرین انصاف نہ ہوگا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے "عثمان ذوالنورین" کا مسودہ حرفاً حرفاً پڑھا، یا اس کی کتابت شدہ کاپیاں ان کے پاس دو سال تک پڑی رہیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا کتاب پڑھ کر مہر تصدیق ثبت کرنا بھی کوئی دلیل نہیں، بشرطیکہ انہوں نے مہر تصدیق ثبت بھی کی ہو، اور نہ اس اطلاع سے اعتراضات ختم ہوتے ہیں۔ ان ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

---

(۱) صدیق اکبر، ص ۸۷۔

سید حسنین احمد ندوی، فاضل دیوبند

اظہارِ رائے کی آزادی اور شیطانی آیات

اظہار رائے کی آزادی انسانی قدروں اور سماج کی تعمیر و تشکیل میں انتہائی اہم اور بنیادی رول ادا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرہ جو اس آزادی سے محروم ہو، یا جہاں غور و فکر اور زبان و بیان پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں، وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے اور عالم انسانیت کے لئے کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دے پاتا۔ اظہارِ رائے کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام نے اسے نہ صرف مباح و جائز قرار دیا ہے، بلکہ واجبات و فرائض کی فہرست میں شامل کیا ہے اور بحیثیت مسلم ہر شخص کے لئے ضروری وصف قرار دیا کہ وہ اپنی استطاعت اور قوت کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کرے اور اس میں پس و پیش سے کام نہ لے:

تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آلِ عمران ۱۰۰) وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص وقتی مصلحت، یا مفاد کی خاطر تملق، چاپلوسی یا جی حضوری سے کام لے کر حق و صداقت پر مبنی بے لاگ رائے کا اظہار نہ کرے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

"میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں، جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے، وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں"۔[1]

آپؐ نے خود حضرات صحابہؓ کی تربیت کچھ اسی انداز سے فرمائی اور آزادانہ اظہار رائے کی اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ صحابہؓ اس کے عادی بن گئے اور پھر آپؐ کی زندگی میں، یا اس کے بعد کوئی چیز ان کی اس آزادی پر قدغن نہ لگا سکی، تاریخ و سیر کی کتابیں اس کے ذکر سے بھری پڑی ہیں:۔ ایک غزوہ میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پڑاؤ ڈالیں، ایک صحابیؓ نے دریافت کیا: "یہ ارشاد وحی سے ہے یا آپؐ کی ذاتی رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے، صحابی نے عرض کیا

(۱) نسائی، کتاب البیع۔

پھر تو یہ منزل مناسب نہیں، اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہوگی، چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص: ۲۹۵)

شام کے سفر میں ایک مجمع میں حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کی وجہ بیان کی تو ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا کہ:

"اے عمر! خدا کی قسم تو نے انصاف نہیں کیا، تو نے رسول اللہؐ کے عامل کو برطرف کر دیا، تو نے رسول اللہؐ کی کھینچی ہوئی تلوار کو نیام میں ڈال دیا، تو نے قطع رحم کیا، تو نے اپنے چچیرے بھائی پر حسد کیا۔" (الفاروقؓ، ص ۴۶۶)

اس طرح ایک حقیقت ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کا شعور جس کی گونج آج یورپ میں سنائی دیتی ہے، یہ اسلام ہی کا عطیہ ہے۔ اسلام نے اظہار رائے کی آزادی کی شمع اس وقت روشن کی، جب کہ سارا یورپ جبر و قہر کے بدترین دلدل میں دھنسا ہوا تھا اور اس تاریک ماحول میں آزادانہ کسی رائے کا اظہار تو دور کی بات ہے، کسی موضوع پر غور و فکر کی دعوت ہی اقتدار کلیسا کے لئے چیلنج تصور کیا جاتا تھا، اور اس کا نتیجہ ہمیشہ موت ہوا کرتا تھا۔

اس موقع سے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلام نے اظہارِ رائے کی جو آزادی عطا کی ہے وہ مثبت اور تعمیری ہے، منفی یا تخریبی نہیں، لہٰذا وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کی آڑ میں کوئی شخص دوسروں کی عزت و حرمت پر حملے کرے، اسلئے کہ یہ رائے کا اظہار نہیں بلکہ خبثِ باطن کا اظہار ہے، اس قسم کی چھوٹ سے سارا معاشرہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور اس سے فتنہ و فساد کا وہ سیلِ رواں کھلتا ہے، جو انسان کے سب سے قیمتی سرمایہ یعنی عزت و عصمت اور مقدسات و محرمات تک کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ چنانچہ یہود جو برملا حضرت مریمؑ پر زنا کی تہمت لگاتے تھے، قرآن پاک نے سختی سے اس کی مذمت کی اور اس کے انجامِ بد سے ڈرایا، اس طرح اسلام نے حد قذف کا ضابطۂ قانون عطا فرمایا، تاکہ معاشرہ میں ہر شخص کی عزت و ناموس محفوظ رہے اور کوئی شخص کسی کی عزت و عصمت پر آسانی سے انگلی اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔

والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعۃ شھداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ

جو لوگ پرہیزگار عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انہیں

ولا تقبلوا لهم شہادۃ ابدا اولئک هم الفاسقون۔ | اسی کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو، اس لئے کہ یہ خود ہی بدکردار ہیں۔

(النور: ۴)

اس طرح کسی پر زنا کا الزام اور پھر اس کا ثبوت اتنا مشکل اور دشوار بن گیا کہ عام حالات میں بمشکل ہی کوئی شخص اس کی جرأت کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلام نے جہاں معاشرہ کے ہر فرد کو عزت و ناموس کا تحفظ فراہم کیا ہے، وہیں لوگوں کی شخصی حیثیت اور ذات کو بھی خاصی اہمیت دی ہے، چنانچہ اسلام کی نظر میں ہر ایسا شخص ملزم اور قابلِ مواخذہ تصور کیا جائے گا جو کسی کے ساتھ بد کلامی سے پیش آئے، گالی دے، یا کوئی ایسا لفظ کہے جو مخاطب کے لئے ناپسندیدہ اور دل آزار ہو، اس جرم کی کوئی متعین سزا تو نہیں، البتہ تعزیری سزا واجب ہو گی، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی سے کہے، اے فاجر[۱]۔ اے فاسق[۲]۔ اے منافق[۳]۔ اے مخنث[۴] اے پلید[۵] یا اور اس قسم کا کوئی لفظ، تو اسے تعزیری سزا دی جائے گی۔

انسان کی ذاتی حیثیت اور شخصی وقار کا جو تحفظ اسلام نے لوگوں کو فراہم کیا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ سب برابر ہیں، اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر کوئی مسلم کسی عیسائی یا مجوسی کو اے کافر[۶] کہے اور شخص مذکور اس کی اس بات کا برا مانے تو اس صورت میں بھی ایسا کہنے والے کو سزا دی جائے گی۔

اس طرح کا سب و شتم یا بد کلامی اگر کسی ایسی ہستی کے متعلق ہو جن کی حیثیت پیشوا، مقتدا یا رہنما کی ہو تو اس فعل کی سنگینی مزید بڑھ جاتی ہے، اسلئے کہ اس صورت میں یہ معاملہ کسی ایک شخص کی اہانت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس سے متعلق لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کے لئے باعثِ ہتک اور دل آزار ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایسا ایک واقعہ پیش آیا حضرموت میں کندہ کی

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۱۵۵/۲۔ (۲) المدونۃ الکبریٰ ۲۲/۴
(۳) زیلعی ۲۰۸/۳۔ (۴) درالاحکام ۹۶/۲۔
(۵) المغنی ۲۱/۱۰ (۶) الاشباہ والنظائر ۱۰۰۔

ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور کچھ ایسے اشعار گائے، جس میں آپؐ کے متعلق بعض نازیبا الفاظ تھے، وہاں کے حاکم مہاجر بن ابی امیہ المخزومی نے اسے قطع ید کی سزا دی اور اس واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا، اس کے جواب میں آپؓ نے لکھا: اس صورت سے متعلق اطلاع مجھ تک پہونچ گئی، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، اگر اسے پہلے ہی سزا نہ دی گئی ہوتی تو میں اس کے قتل کی سزا دیتا، اسلئے کہ انبیاءؑ کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہے، اس لئے اگر کوئی مسلم ایسی حرکت کرے تو وہ اس فعل کے ارتکاب سے مرتد سمجھا جائے گا اور اگر کوئی معاہد یا ذمی کرے تو وہ اس ذمہ یا معاہدے کو توڑنے والا سمجھا جائیگا۔(۱)

مذہبی مقدسات و محرمات کا اسلام نے اس قدر پاس ولحاظ رکھا ہے کہ باضابطہ اس بات سے منع کر دیا کہ معبودان باطل کو بھی برا بھلا نہ کہا جائے، اس لئے کہ اس سے ان سے متعلق لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے: ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (انعام: ۱۰۸) جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، انہیں برا نہ کہو"

عزت وعصمت اور مذہبی وقومی مقدسات کا احترام بعض جزئی تبدیلیوں کے ساتھ دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے، کوئی ملک ایسا نہیں ہے، جو مذہبی اور قومی مقدسات کی توہین اور اس پر حملہ کی اجازت دے۔

ان وضاحتوں کی روشنی میں اگر "شیطانی آیات" کا جائزہ لیجئے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس کا اظہار رائے کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اولاً تو اس لئے کہ یہ کوئی علمی، فکری یا تحقیقی کتاب نہیں، محض گھٹیا اور فحش قسم کا ایک ناول ہے، دوسرے اس میں کائنات کے دوسرے سب سے بڑے مذہب پر رکیک حملہ کیا گیا ہے، اس کے عقائد کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اس سے متعلق بعض عظیم اور مقدس ترین ہستیوں کے عزت وناموس پر حملہ کیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب میں بدگوئی، فحش کلامی اور سب وشتم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، پھر بھی مغربی ملکوں کی حمایت اور اس کی سرپرستی تاریخ کا محض ایک المیہ ہے۔ دراصل اسلام کے خلاف ان کے سینوں میں بھرے ہوئے بغض وعداوت نے انہیں ایسا اندھا کر دیا ہے

(۱) طبری، ۳/۹۴۔

کہ حریت و مساوات، تہذیب و تمدن اور انسان دوستی جس کا وہ ہمیشہ نعرہ لگاتے رہے ہیں، وہ اس کی ظاہری پاس داری بھی نہ رکھ سکے۔ یہ اسلام بیداری کی نئی لہر سے انتہائی خوف زدہ ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے اوچھے اور گھٹیا ہتھکنڈوں سے کام لے رہے ہیں، لیکن اس قسم کے ضمیر فروش لوگوں کی ذلیل حرکتوں سے کیا اسلام کا راستہ رک جائے گا؟ اور اس کی نشاۃِ ثانیہ کا عمل ٹلتا رہے گا؟ یریدون ان یطفوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ برطانیہ کی ملکہ یا شہزادی جس کا تعلق صرف ایک ملک کے باشندوں سے ہے اس کی عزت و ناموس پر حملہ کرنے والا قابلِ گردن زدنی اور سزائے موت کا مستحق ہو، لیکن وہ مقدس اور محترم ہستیاں جو کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں، ان کی ناموس پر حملہ کرنے والا انعام کا مستحق قرار پائے۔!!

نعت

مولانا محمد برکت اللہ القاسمی جوہر
استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام — حیدر آباد

سنا ہے میکدے میں تیرے اذن عام ہے ساقی
ترے رندوں کی محفل میں چھلکتا جام ہے ساقی

نہیں پی مدتوں سے توڑ ڈالے ساغر و مینا
ہزاروں جام کے بدلے ترا ہی نام ہے ساقی

شراب مادیت دی ہزاروں بار غیروں نے
مئے روحانیت دینا ترا ہی کام ہے ساقی

ہزاروں سال کے پیاسے نظر ملتے ہی آسودہ
نظر ہی ساغر و مینا نظر ہی جام ہے ساقی

مٹادی قیصر و کسریٰ کی طاقت عزم محکم سے
ترے رندوں کے کاموں میں یہ ادنیٰ کام ہے ساقی

ترا میخانۂ وحدت ترا دست کرم یکسر
پئے جاؤں نہ کیوں آخر صلائے عام ہے ساقی

زمیں سے عرش تک ساری فضا مخمور ہے جوہر
یہ تیری چشم میگوں کا کرشمہ عام ہے ساقی

○

منقبت
اصحابِ رسولؐ

نتیجۂ فکر: مفتی عزیز الرحمٰن شہید، فتحپوری۔ بمبئی

یہ بزمِ ھدیٰ انجمنِ خود نگری ہے
جو بات ہے اصحابِ محمدؐ کی کھری ہے

واللہ یہی وجہ نجاتِ بشری ہے
یہ مدحِ صحابہؓ ہے یہ بالغ نظری ہے

یہ دین کے مفہوم سے ناواقفیت ہے
اصحابؓ کا انکار بڑی کم نظری ہے

صدیقؓ کو دیکھو تو سمجھ جاؤ گے تم بھی
سرکارؐ کا سایہ بہ لباسِ بشری ہے

وہ بدر ہو، یا قبر کہ ھجرت کا سفر ہو
سرکارؐ ہیں، صدیقؓ ہیں، اور ہم سفری ہے

اک خط کا اثر نیل میں طغیانیٔ پیہم
یہ ہیبتِ فاروقؓ ہے یہ تاجوری ہے

یا ساریہؓ! کہتے ہی کہاں پہونچی ہے آواز
کیا شان ہے فاروقؓ کی کیا دیدوری ہے

یہ کہیے کہ اب کوئی نبی ہی نہیں ورنہ
فاروقؓ میں اہلیتِ پیغام بری ہے

عثمانؓ کے لیے بیعتِ رضوانِ صحابہؓ
اک ان کے سبب سب کے لئے خوش خبری ہے

گو ساتھ نہیں پھر بھی علیؓ کا یہ شرف ہے
ھجرت کی شب آقا کی جگہ شب بسری ہے

ہر ایک صحابیؓ ہے بہم رحم کا پیکر
کفّار مقابل ہوں تو بے مثل جری ہے

کچھ لوگ ہیں جو نور کو بھی کہتے ہیں ظلمت
کیا دور ہے، کیا لوگ ہیں، کیا بے بصری ہے

ہم تو ہیں شہید اسوۂ اصحابؓ کے پیرو
اور اس کے سوا جو بھی ہے وہ دردِ سری ہے

ایک نو مسلم مغربی عیسائی کی کہانی

خود اس کی زبانی

ترجمانی: مولانا نورالحق رحمانی (فاضل دیوبند)

جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو میں رضاکارانہ طور پر فوج میں بھرتی ہوا اور سمندری سفر طے کرکے فرانس پہونچا، اور شہسوار ٹیم میں شامل ہوگیا۔ پھر جنگ کے میدانوں میں مسلسل تھپیڑے کھاتا رہا، آج یہاں کل وہاں، میدانِ جنگ بھی کیا تھا، جہنم کا نمونہ، مغربی میدان میں ایک عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا، جہاں جنگ کے وہ خوفناک اور بھیانک مناظر سامنے آئے جس کی منظر کشی نہ کسی خطیب کی زبان کرسکتی ہے، نہ کسی ادیب کا قلم!

پھر جب میں اپنے وطن "اسکاٹ لینڈ" لوٹا تو یہاں اپنی ماں اور اپنے تینوں بھائیوں کے مارے جانے کی الم ناک خبر سنی، جس کا دل پر بے حد صدمہ ہوا، اب دنیا میرے سامنے تاریک تھی اور زندگی بے لطف و کیف، "اسکاٹ لینڈ" میں اب میرے لئے کوئی کشش باقی نہ تھی، رختِ سفر باندھا اور دنیا کی سیر و سیاحت کے لئے نکل پڑا، پھر ہندوستان چین اور دوسرے ممالک کی سیاحت کی، اس دوران وقت گذاری کے لئے مختلف زبانوں کو سیکھنے اور مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ کرنے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نظر نہ آیا، شام میں عربی زبان سیکھی اور مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن مجھے **قرآنِ کریم** کے مطالعہ میں جو لطف و لذت کیف و سرور اور قلبی سکون و اطمینان محسوس ہوا وہ کسی بھی مذہب کی کتاب میں محسوس نہ ہوا، قرآنِ کریم کا مطالعہ میں نے متعدد بار کیا اور اس کے معانی و مطالب، اسرار و حکم اور حقائق و دقائق پر غور کرنے لگا میں نے اس میں ایک عجیب قسم کی لذت و حلاوت، رعب و جلال اور ساحرانہ تاثیر پائی، جس نے مجھے اس کے مطالعہ کا گرویدہ بنا دیا، اب شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا جس میں قرآن کریم کی کوئی سورت یا کم از کم چند آیتیں نہ پڑھ لیتا۔

شام سے میں اسکندریہ (مصر) آیا، پھر وہاں سے "دمنہور" پہونچا۔ یہاں ایک دفعہ ایک حوض کے کنارے بیٹھا تھا، اچانک آنکھ لگ گئی، خواب میں دیکھا کہ دھوئیں زمین سے اوپر کو اٹھ رہے ہیں اور فضاؤں میں منتشر

ہو کر پھر جمع ہو رہے ہیں، پھر اچانک اس سے ایک عجیب روشنی نمودار ہوئی اور اس نور کی کرنوں کے باہمی ربط سے "الاسلام" کا لفظ بنا، اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ وہ لفظ "الاسلام" میرے پورے وجود میں سماگیا ہے۔ رمیرے تمام حواس پر پوری طرح مسلط ہوگیا ہے' اب مجھے یقین آیا کہ اللہ نے میری حیرت و پریشانی دور فرمادی اور غیب سے میرے لئے دین اسلام کا انتخاب فرمایا، مجھے اس دین کے اختیار کرنے میں انتہائی قلبی تسلی اور ذہنی سکون کا احساس ہوا۔ وہ دین جو خیر خواہی، ایثار و ہمدردی، مساوات و برابری، شفقت و محبت اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے..... جب اسلامی روح میرے دل میں سرایت کر گئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ نعمتِ ایمانی میرے لئے عطیۂ خداوندی ہے' پھر میری نظر میں مادی وسائل، دنیاوی عیش و عشرت کے اسباب اور دل لبھانے والی چیزوں کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔

واضح رہے کہ تبدیل مذہب کا میرا یہ فیصلہ وقتی تاثر یا محض اس خواب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ سالہا سال کے مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجے میں جب اس دین کی صداقت و حقانیت مجھ پر واضح ہوئی اور پوری تحقیق و تفتیش کے بعد جب میرا دل و دماغ اس پر مطمئن ہو گیا تو میں نے اسے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس موقع پر ایک اور واقعہ کا تذکرہ فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، میں جب فلمی ڈائرکٹر کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کام کر رہا تھا تو مجھے ایک دفعہ ایک ایسے وجیہ اور بارعب شخصیت کے حامل مسلمان مؤذن کی تصویر کشی کی ضرورت پیش آئی، جو رقت آمیز اور شیریں آواز میں اذان خانے کی بلندی سے اذان دے رہا ہو، ایسے مؤذن کی تلاش میں جو مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہو جلد ہی کامیابی ہوئی، چنانچہ میں اس کی تصویر کشی کے لئے تیار ہو کر بیٹھا، جب اس مؤذن نے نہایت پر کیف اور شیریں آواز میں اذان دینی شروع کی تو میرا دل ہل گیا، میرے پاس وہ الفاظ نہیں' جن کے ذریعہ اس کیفیت اور قلبی تاثر کا اظہار کر سکوں' جو اذان سننے کے وقت مجھ پر طاری ہوئی، تصویر کشی سے فراغت کے بعد میں نے اس مؤذن سے چند لمحے گفتگو کی اور اسلام کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا، گفتگو کے دوران انہوں نے اسلام کی بعض حکمتوں، باریکیوں اور اس کے احکام کے محاسن اور خوبیوں کا تذکرہ کیا، اس گفتگو نے بھی میرے قلب و دماغ پر بڑا گہرا اثر چھوڑا، بالآخر میں نے اسلام قبول کر لیا میرا شعور و وجدان فرحت و انبساط اور سکون و اطمینان کی ایسی کیفیت سے آشنا ہوا جو اب تک میرے لئے نئی اور اجنبی تھی، رفتہ رفتہ ایمان کی یہ کیفیت یقین کے اس درجہ میں داخل ہوگئی، جیسے وہم و گمان' وسوسے اور شکوک و

شبہات کی آندھیاں اپنی جگہ سے متزلزل کرنے میں ناکام رہتی ہیں، مجھے اسلام کے مبارک اور دراز سائے میں ابدی مسرت، دائمی فلاح وسعادت اور دینی و دنیاوی کامرانی کا احساس ہونے لگا اور ان دنیاوی لذائذ، مرغوبات اور تعیش سے نفرت وکراہت ہونے لگی جو عام طور پر انسان کو خود غرض، لذت کوش، آرام طلب اور سست و کاہل بنا کر آخرت سے بیگانہ اور غافل کر دیتی ہیں۔

اسلام نے مجھے غلط عقائد و نظریات، غیر اللہ کی پرستش، دنیاوی حرص وطمع، باطل زندگی کے فریب اور خود پسندی و خود فراموشی کے دلدل سے نکال کر اسلام کی شاہراہ اور کھلی فضا میں لا کھڑا کیا اور ایسے اصول و عقائد اور احکام و قوانین سے روشناس کرایا جو فطری اور وحی الٰہی پر مبنی ہیں اور بنی نوعِ انسانیت کے لئے رحمت اور خیر و برکت کا ذریعہ ہیں۔

اسلام نے جوا، شراب اور تمام نشہ آور چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دے کر میری صحت، ذہن و عقل اور میری زندگی کو ہلاکت و تباہی سے بچا لیا، قرآنِ کریم کی درج ذیل آیت اسی حقیقت کو واشگاف اور آشکارا کرتی ہے:

اتل ما اوحی الیک من الکتاب واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون ○	اے پیغمبرؐ! آپؐ پر قرآن کا جو حصہ نازل ہوا ہے، اس کی تلاوت کیجئے اور نماز قائم کیجئے، بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روک دیتی ہے، اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے
(سورۃ العنکبوت)	اور خدا تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

مولانا مفتی عبدالودود مظاہری
مفتی دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

سوال و جواب

قضاء عمری کا طریقہ

فوت شدہ نمازوں کے ادا کرنے کا مسئلہ پوری وضاحت سے لکھ کر روانہ فرمائیں تو عین کرم ہوگا۔

الجواب : اگر پچھلی نمازوں کی قضاء کا ارادہ ہو تو پہلے یہ غور کر لیا جائے کہ کتنے دن یا کتنے مہینے یا کتنے سال کی نمازیں فوت ہوئی ہیں، اگر متعین طور پر یاد ہو تو روزانہ جتنی نمازیں ادا کر سکتے ہیں، اس کا اندازہ کر لیں، پھر اس طرح نیت کریں کہ میری فوت شدہ نمازوں میں سے پہلے فجر کی نماز قضاء پڑھتا ہوں ——— اور اگر پچھلی نمازوں کی تعداد معلوم نہیں ہے تو بلوغ کے بعد سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا اندازہ کر لیں، پھر اسی ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے نماز ادا کریں، مثلاً پہلے فجر کی، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کریں۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہر ادا نماز کے ساتھ ایک نماز کی قضاء کر لیں، خواہ وقتیہ نماز سے قبل پڑھیں یا اس کے بعد ادا کریں۔ نمازوں کی قضاء کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ فرض اور واجب ہی کی قضاء لازم ہے، سنن و نوافل کی قضاء لازم نہیں ہے۔

مسافتِ قصر

حالتِ سفر میں قصر کے مسئلہ میں میرے ذہن میں تشویش ہے، وہ یہ کہ حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کی وجہ سے روزانہ ۸۳ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، اتنی لمبی مسافت میں کیا نمازوں میں قصر کی شرعاً اجازت ہوگی؟ اس سلسلے میں ہمیں شرعی حکم کی رہنمائی کریں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی وضاحت کر دیں کہ قصر کے لئے ہمیں کون سی اور کیسی نیت کرنی ضروری ہوگی؟ ——— یہ بھی واضح رہے کہ ۲۳ کیلومیٹر شہر سے باہر اور دس کیلومیٹر دفتر تک جانے کے لئے اندرونِ شہر راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔

جواب : سفر شرعی کے متحقق ہونے کے لئے احناف کے نزدیک ۷۸ کیلومیٹر ہونا ضروری ہے۔

یعنی اسی صورت میں شرعاً قصر کی اجازت ہوگی، جب کہ سفر کی اتنی مسافت طے ہوئی ہو، آپ کی بیان کردہ مسافت قصر کے لئے مقررہ مسافت تک نہیں پہونچتی ہے، کیونکہ اندرونِ شہر سفر شرعی کی مسافت میں شامل نہیں ہوتا، بلکہ فناءِ شہر تک کی مسافت قصر کی اجازت کے لئے معتبر ہوتی ہے اور یہاں فناءِ شہر سے باہر صرف ۳۰ کیلومیٹر ہے جو ۴۸ میل سے کم ہی ہے، اس لئے قصر کی اجازت نہ ہوگی

متروکہ میں بہن کا حصّہ

حسب ذیل امور سے متعلق چند تفصیلی جوابات مطلوب ہیں، ازراہِ کرم درج ذیل سوالات کے شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔ میرے والد کے انتقال کے وقت (۱۹۵۲ء وفات) حسب ذیل ورثاء موجود تھے۔ والدہ منور بی صاحبہ، مرحوم کی اولاد میں محمد عبدالقدوس، محمد عبدالوہاب، عظمت النساء بیگم، شوکت النساء بیگم، والد محمد عثمان صاحب کے انتقال کے وقت مرحوم کی جائیداد میں یہ تھیں، ایک مکان جو کتہ پلی میں واقع ہے، یہ بالکلیہ ان کی اپنی ملکیت تھی اور ایک پلاٹ (۴۰) گنٹہ موقوعہ کریم نگر یہ پلاٹ والد صاحب کی زندگی میں محمد عبدالقیوم اور محمد عبدالوہاب نے اپنی کمائی ہوئی رقم سے خریدا جس کی قیمت ۳۰۰۰/- اس کے منجملہ ۲۰۰۰/- عبدالقیوم نے اور ۱۰۰۰/- عبدالوہاب کی رقم محمد عثمان کے پاس جمع تھی، اس رقم سے یہ جائیداد خریدی گئی، والد محمد عثمان صاحب کے انتقال کے بعد تقریباً دو سال بعد یعنی ۱۹۵۳ء کے اخیر میں والدہ صاحبہ کی موجودگی میں تقسیم عمل میں آئی۔ تقسیم کے وقت دونوں بہنیں عظمت النساء اور شوکت نے نہ تو ترکہ کا مطالبہ کیا اور نہ تقسیم کے وقت ورثاء نے یہ مسئلہ اٹھایا اور نہ ہی تقسیم کرنے والوں نے، چنانچہ جائیداد مشترکہ سمجھتے ہوئے تقسیم عمل میں آئی اور کریم نگر میں واقع شدہ پلاٹ کی تقسیم کے وقت اعتراض بھی اٹھایا گیا، یہ جائیداد دونوں بھائیوں کی خریدی ہوئی ہے، پھر یہ تقسیم کیوں کر ہوگی؟ لیکن پھر بھی اس جائیداد کو مشترک ہی رکھا گیا، اس پر ہم دونوں بھائیوں (خریداران زمین واقع کریم نگر) نے خاموشی اختیار کی اور تقسیم تینوں بھائیوں میں کیا گیا۔ ازراہِ کرم اس جائیداد کی شرعی حیثیت سے مطلع فرمائیں ——— تقسیم میں چھ ملگیات تھیں، جو مساوی حیثیت سے تینوں بھائیوں میں تقسیم کردی گئیں، البتہ طے پایا کہ جب تک والدہ باحیات ہیں ان ملگیات سے وہ استفادہ کریں گی، ان کے انتقال کے بعد ہی ہر شخص اپنے حصوں پر قابض ہو سکے گا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا اور تمام بھائیوں نے اپنے حصوں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ۱۹۷۴ء مارچ میں بڑے بھائی عبدالقدوس صاحب کا انتقال

ہو گیا، ان کے انتقال سے قبل ہی جائیداد کی تقسیم ہو چکی تھی، جیسا کہ اوپر بتلایا گیا، اور ۱۹۷۹ء میں بھائی عبدالوہاب کا انتقال ہوا۔

اب میں (عبدالقیوم) صرف باحیات ہوں اور چاہتا ہوں کہ میں اپنے حصہ سے اپنی بہنوں کا حصہ ادا کر دوں، اب میرے حصہ میں جو جائیداد آئی ہے اس کی قیمت ۵۰۰۰۰/- ہے، اب اس رقم میں سے کتنی رقم دونوں بہنوں کو دینا ہوگا مطلع فرمائیں۔

الجواب: اولاد کی طرف سے جو مال والدین کو دیا جاتا ہے، اگر بلا کسی نیت کے دیا تو وہ والدین کا متصور ہوگا، اس سے خریدی ہوئی جائیداد تمام ورثاء میں تقسیم ہوگی اور اگر اولاد نے بطور امانت رکھا اور پھر خود رقم لے کر کوئی جائیداد خریدے، یا والد سے کہہ دے تو یہ جائیداد اولاد کی متصور ہوگی، ورثاء کا اس میں حق نہ ہوگا۔

میراث کی تقسیم کے وقت مرحوم کی بیٹیوں یا بہنوں کا مطالبہ نہ کرنا، یا اس مسئلہ کا نہ اٹھایا جانا ان کے حق وراثت کو ختم نہیں کرتا ہے، جب تک انہیں یہ نہ بتا دیا جائے کہ وراثت کے لینے کے یہ بھی حقدار ہیں اور انہیں اتنا حق مل رہا ہے اور پھر وہ کسی وارث کے لئے اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں تو وہ اپنے حق سے دست بردار شمار ہوں گے، ورنہ وراثت کا حق دیگر ورثاء کی طرح انہیں بھی دینا ضروری ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں ضروری ہے کہ بہنوں کو ان کا حق بتا دیا جائے کہ اتنا ہے۔ مثلاً یہاں والدہ کی وفات کے بعد جائیداد کے آٹھ حصے کئے جائیں گے، جس میں سے ہر بھائی کو دو دو اور ہر بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا، اگر میت کی کل جائیداد کی قیمت ۸۰۰۰۰/- اسی ہزار ہو تو اس میں سے ہر بھائی کو ۲۰۰۰۰/- بیس ہزار اور ہر بہن کو ۱۰۰۰۰/- دس ہزار حصے ملیں گے۔ بہنوں کے ان حصوں سے واقف کرانے کے بعد اگر بہنیں اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں اور کہیں کہ آپ لوگ آپس میں تقسیم کر لیں تب تو درست ہے ورنہ نہیں۔ والد مرحوم کی جائیداد میں سے اگر ہر ایک بھائی کو ۵۰۰۰۰/- پچاس ہزار ملے ہوں تو ہر ایک بھائی کے حصے میں سے دونوں میں سے ہر بہن کو ۶۲۵۰/- چھ ہزار دو سو پچاس روپے ملیں گے، مجموعی طور پر ایک بہن کو ۱۸۷۵۰/- اٹھارہ ہزار سات سو پچاس روپے ملیں گے۔ ———— اگر مرحوم بھائی کے حصوں میں سے آپ بہنوں کو دلانے پر قادر نہیں ہیں تو صرف اپنے حصے میں سے دونوں بہنوں میں سے ہر ایک کو ۶۲۵۰/- چھ ہزار دو سو پچاس روپے دیدیجئے۔

٭ ٭

ترتیب: مولانا محمد یوسف مفتاحی

خبر نامہ
دار العلوم سبیل السلام

دینی مدارس اور اس کے مقاصد سے عام مسلمانوں کا جو گہرا تعلق ہے، وہ ایک مسلمان کی دینی حمیت، اور دین دوستی کی علامت ہے، اسی جذبہ کے تحت دوسرے دینی مدارس کی طرح دار العلوم سبیل السلام میں بھی اکثر علماء، دانش ور اور دین دوست حضرات کا دورہ ہوتا رہتا ہے ——— چنانچہ مورخہ ۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو جناب عمر محسن باغزال صاحب اپنے مختلف اعزہ و احباب کے ساتھ مدرسہ تشریف لائے اور چار پانچ گھنٹے مدرسہ میں قیام فرمایا موصوف کے اعزاز میں مدرسہ کے طلباء نے ایک استقبالیہ بھی دیا جس میں معزز مہمانوں کے علاوہ اساتذہ، ناظم صاحب اور صدر مجلس انتظامی الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب بھی شریک ہوئے اس موقع سے مہمان معزز نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور مدرسہ کی کارکردگی پر مسرت ظاہر کی۔

○ مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ روز پیر کو مولانا محمد رابع ندوی صاحب کی قیادت میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر اساتذہ اور دوسرے علماء پر مشتمل ایک وفد مدرسہ آیا، جن میں مولانا عبد الکریم پاریکھ (ناگپور) مولانا حبیب ریحان ندوی ازہری (بھوپال) مولانا سعید الاعظمی ندوی، استاذ ادب ندوۃ العلماء (لکھنؤ) مدیر عربی جریدہ "البعث الاسلامی" مولانا عبد النور صاحب۔ جناب انیس چشتی صاحب (پونہ) مولانا شفیق الرحمن صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء مولا عبد اللہ سورتی (گجرات) شامل تھے۔

ان حضرات کے عصرانہ کا نظم مدرسہ کی زیر تکمیل جدید عمارت میں ترتیب دیا گیا تھا، مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم مدرسہ ہٰذا نے مہمانوں کا استقبال کیا اور خیر مقدمی کلمات فرمائے اور ان کی تحریک پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس نے مدرسہ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے نظام تعلیم، نصاب اور موجودہ تعلیمی پیش رفت پر روشنی ڈالتے ہوئے، خاص طور پر "مختصر مدتی عالم کورس" کا ذکر فرمایا اور اسے ایک کامیاب تجربہ قرار دیا اور مدرسہ میں اس سال قائم شدہ شعبہ "تخصص فی الفقہ" کے بارے میں تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ آج کے دور میں

دین اسلام کے لئے ایک اہم ضرورت ہے کہ ایسے فاضل علماء تیار کئے جائیں، جو نہ صرف مروجہ کتابوں کے عالم ہوں بلکہ ان کی صلاحیت اور استعداد ایسی ہو کہ جدید مسائل پر وہ بصیرت کے ساتھ کام کر سکیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ فقہ کے بنیادی اصول و قواعد اور نصوصِ شرعیہ پر ان کا مطالعہ گہرا اور عمیق ہو، فقہی ماخذ پر ان کی وسیع نگاہ ہو۔ نیز فرمایا کہ ہم لوگوں نے اسی عزم و ہمت کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور اب تک کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکتا اور بہتر نتیجہ کی توقع کی جا سکتی ہے ——— وفد کا استقبال کرتے ہوئے طلبہ کی جانب سے مولوی خالد حسین صدیقی (متعلم دورۂ حدیث) نے ایک مختصر منثور سپاس نامہ پیش کیا۔ اس موقعہ پر مولانا سلمان ندوی اور مولانا محمد رابع ندوی نے بھی خطاب کیا اور طلبہ کو مفید نصیحتیں فرمائیں اور مدرسہ کی تعلیمی ترقی اور خاص طور پر شعبۂ تخصص فی الفقہ کے قیام اور کامیاب پیش رفت پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ کی دعاء پر نشست برخاست ہوئی۔

○ مورخہ ۴ ربیع الثانی تا ۸ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ مدرسہ میں ششماہی امتحان منعقد ہوا اور ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کو نتائج کا اعلان کیا گیا۔ ۵۰ طلبہ نے اعلیٰ درجہ سے ۲۲۱ طلبہ نے اوسط درجہ سے اور ۸۰ طلبہ نے ادنیٰ درجہ سے کامیابی حاصل کی، جب کہ ۲۳ طلبہ کو ناکام قرار دیا گیا، مجموعی طور پر تمام شعبوں میں الگ الگ امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ کے نام اور ان کے نمبرات کا اوسط اس طرح ہے:

شعبۂ عربی

			اوسط
اوّل:	خالد حسین صدیقی	(دورۂ حدیث)	۹۰
دوم:	عبدالرحمان	(اوّل عربی)	۸۵
سوم:	قمر عالم	(دوم عربی)	۸۳

شعبۂ حفظ:

اوّل:	عبدالعزیز لیجی	۹۱
دوم:	سید تاج الدین	۸۹
سوم:	محمد یاسر	۸۸

شعبۂ اردو:

اوّل : محمد حامد (اول اردو) ۸۵

دوم : عبدالرحمان (" " ") ۸۴

سوم : شیخ ذاکر (" " ") ۸۳

مدرسہ سے دئے جانے والے انعامات کے علاوہ حضرت ناظم صاحب نے امتیازی نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کے لئے خصوصی انعامات کا اعلان بھی فرمایا۔

○ مورخہ ۲۸ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ کو مدرسہ کی خصوصی دعوت پر مولانا محمد مکی حجازی استاذ مسجد حرام، حیدرآباد تشریف لائے، حرم پاک اور اس کے خدام سے مسلمانوں کو جو والہانہ لگاؤ اور فطری انس ہے، اس کا تقاضا تھا کہ ہر شخص چشم براہ ہو، مسلمانوں کی اسی جذباتی وابستگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور مہمان معزز کے سفر کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنانے کی غرض سے ۲۵ ربیع الاوّل سے ۳۰ ربیع الاول تک تقریباً پندرہ مقامات پر مولانا کا خطاب ہوا، شہر اور اضلاع ہر جگہ مولانا کا شایانِ شان استقبال کیا گیا، آپکے خطاب میں کثیر اژدہام دیکھا گیا، بعض جگہ تو پانچ پانچ گھنٹے لوگوں نے انتظار کیا، سب سے اہم پروگرام دارالعلوم سبیل السلام بارکس میں مورخہ ۲۸ ربیع الاول بروز اتوار دن کے ۱۰ بجے جدید عمارت کے وسیع میدان میں منعقد ہوا، شہر اور بیرونِ شہر کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ مولانا موصوف نے "دینی تعلیم اس کی اہمیت اور علماء کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے نہایت پر مغز اور با اثر تقریر فرمائی، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم مدرسہ ہٰذا نے خیر مقدمی کلمات فرمائے اور قاری عبداللہ کلیمی کی تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا، جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی صدر مدرس مدرسہ نے تعارفی خطاب فرمایا، مولانا موصوف کی دعا پر ۱۲ بجے اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب (صدر) نے شکریہ ادا کیا۔

○ مورخہ ۷ صفر ۱۴۱۰ھ ہفتہ کو مولانا محمد طاہر حسین قاسمی ناظم مدرسہ سبیل الہدیٰ محبوب نگر کی دعوت پر حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ناظم مدرسہ ہٰذا، الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب، صدر مجلس انتظامی، مولانا زبیر احمد صاحب شیخ الحدیث اور راقم بھی شریکِ سفر تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ کے ہاتھوں مدرسہ کی مرکزی عمارت کے سنگِ بنیاد کی رسم انجام پائی، بعد نماز مغرب حضرت ناظم صاحب و شیخ الحدیث حضرت مولانا زبیر احمد صاحب کا خطاب بھی ہوا۔ مدرسہ کا محلِ وقوع ایک پس ماندہ علاقہ ہے، لیکن وہاں کے مسلمانوں کی شخصی دلچسپی اور خاص کر مولانا محمد طاہر صاحب کی بے لوث خدمت نے مختصر عرصہ میں مدرسہ کو

ترقی کی طرف گامزن کر دیا ہے۔

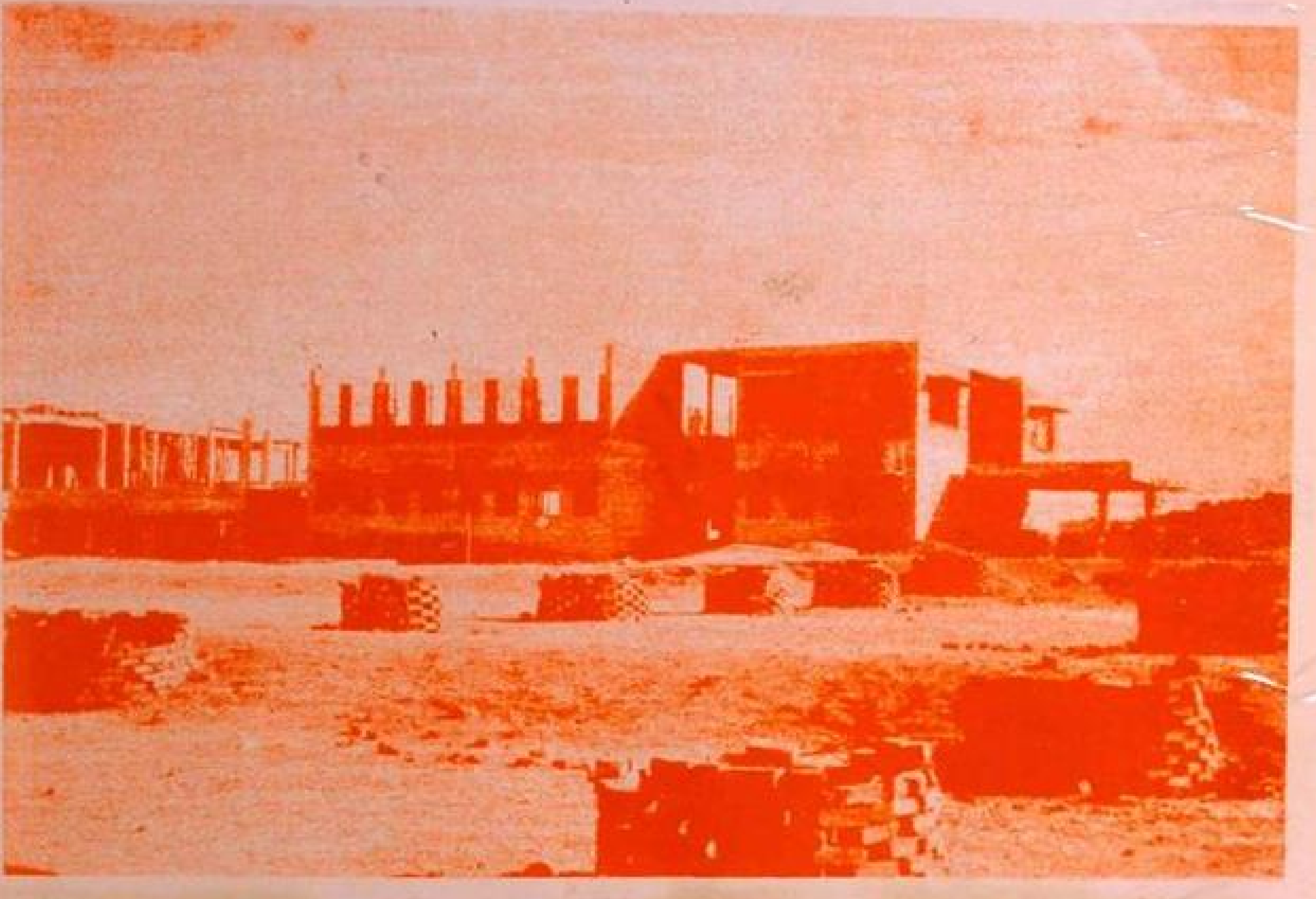
○ مورخہ ۲۱ صفر ۱۴۱۴ھ کو حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب، جناب ضیاء الرحمٰن صاحب صدر مدرس اور راقم نے ورنگل کا سفر کیا، اس سفر میں جناب عبدالرحیم قریشی سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور مشہور دینی و ملی رہنما جناب غوث خاموشی صاحب بھی تھے، اس سفر کے داعی مولانا محمد یوسف مظاہری تھے جن کی قیادت اور سربراہی میں نوجوانانِ ورنگل نے "نئی نسل اور اسلامی تاریخ" کے عنوان سے ایک سمینار کیا تھا، سمینار سے حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب، جناب غوث خاموشی صاحب اور جناب رحیم قریشی صاحب نے خطاب کیا بعد میں حضرت ناظم صاحب نے دار العلوم سبیل السلام کی شاخ ورنگل کا معائنہ بھی فرمایا اور وہاں کے تعلیمی و تربیتی نظام پر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ ۲۳ صفر کو حیدرآباد واپسی ہوئی۔

○ مورخہ ۲۵ صفر کو مجلسِ علمیہ آندھرا پردیش کے زیر اہتمام اساتذہ کے لئے تربیتی کیمپ بھونگیر میں منعقد ہوا، جس میں مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب اور مولانا محمد برکت اللہ صاحب قاسمی استاذِ حدیث مدرسہ ہٰذا نے شرکت فرمائی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس مدرسہ ہٰذا بھی مدعو تھے، لیکن مدرسہ کے تعلیمی و انتظامی امور کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اس کیمپ کے تحت ائمہ مساجد اور مدارس کے ابتدائی اساتذہ کی تدریسی اور اخلاقی تربیت اور تدریب کا نظم کیا گیا تھا، اس کیمپ نے ریاست کے مختلف موقر علماء سے استفادہ کیا۔ حضرت ناظم صاحب اور حضرت مولانا برکت اللہ صاحب نے بھی شرکاء سے خطاب کیا۔

○ ماہ صفر میں دار العلوم سبیل السلام کے معائنہ کی غرض سے اصحاب علم کی ایک جماعت آئی، جن میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری، استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند، مولانا سید ابراہیم ندوی، صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری مدیر عربی جریدہ صوت الامۃ (بنارس) ڈاکٹر محمد اقبال ندوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر معین الدین ندوی، صدر شعبہ فارن لنگویج، پروفیسر شاستری صاحب (جامعہ عثمانیہ) پروفیسر ڈی صاحب (جامعہ عثمانیہ) اور دیگر علماء و دانشور موجود تھے، ان کے اعزاز میں ایک مختصر سا استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم مدرسہ نے استقبال کرتے ہوئے معزز مہمانوں کا تعارف کرایا۔ چونکہ اس نشست میں طلبہ بھی شریک تھے، اس لئے حضرت ناظم صاحب کی درخواست پر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے طلبہ سے خطاب بھی کیا اور مفید تجربات اور عمدہ و بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں۔ مہمانانِ کرام نے مدرسہ کے تعلیمی و تربیتی نظم کی تفصیلات معلوم کر کے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے دارِ قدیم کا ایک حصہ



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی زیر تعمیر دو منزلہ درس گاہ کی عمارت کا ایک منظر

جس میں جملہ ۲۲ کمرے ہیں، ان کمروں میں ۲ بڑے ہال "دارالقرآن" اور "دارالحدیث" شامل ہیں

Phone : 239450

DARUL-ULOOM
SABEEL USSALAM
Sabeel Nagar, Balapur, Behind